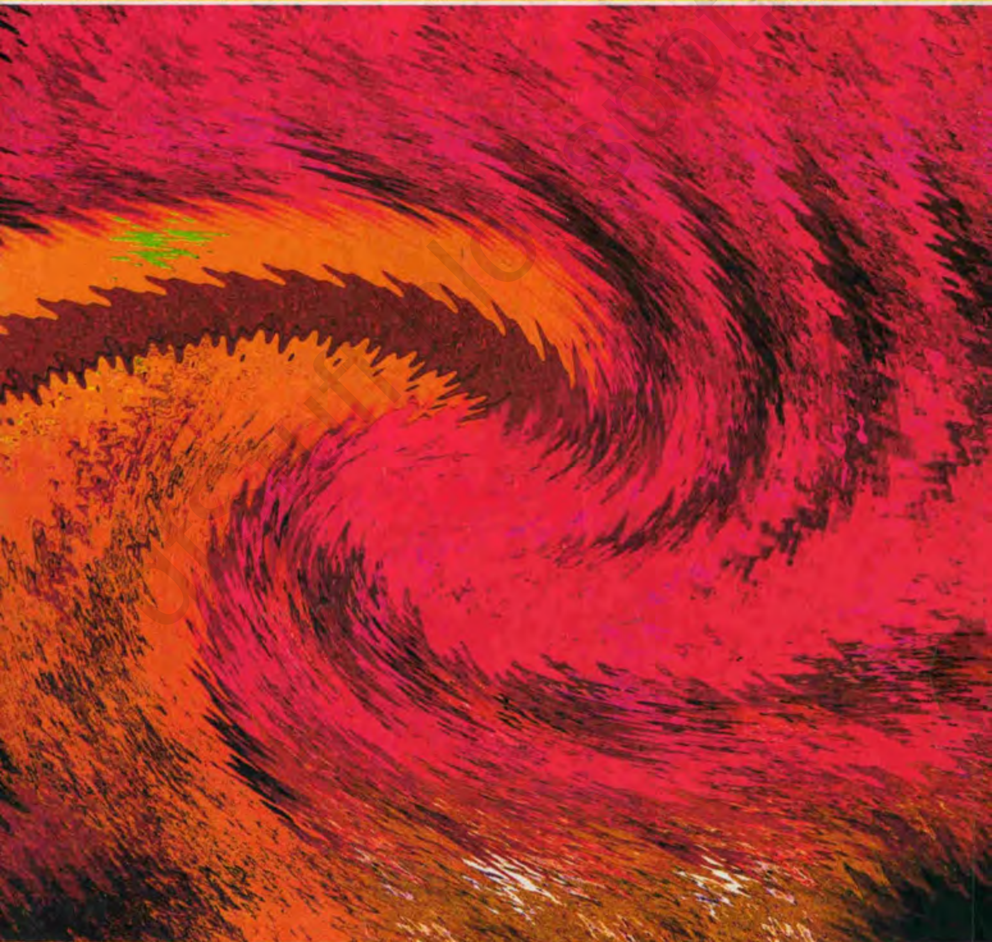
اے حمید

طوفان کی رات



طوفان کی رات

اس رات بارش اور تیز ہوا کا زبردست طوفان آیا۔
موسلادھار بارش نے چاروں طرف دھند کی دبیز چادر تان دی۔ سڑکوں اور نشیبی علاقوں میں پانی کھڑا ہوگیا۔ شہر میں ٹیلی فون اور بجلی کا انتظام درہم برہم ہوگیا۔ بجلی بار بار کوندتی۔ بادلوں کی گرج نے آسمان سر پر اٹھا لیا۔ کئی مکانوں کی چھتیں اڑ گئیں۔ کئی درخت اکھڑ کر فٹ پاتھ پر گر پڑے۔ کالے کالے بادلوں نے سرشام ہی سے شہر کے اوپر منڈلانا شروع کر دیا تھا۔ رات کے اولین لمحوں تک تو ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چلتی رہی۔ پھر ہلکی ہلکی بوندا باندی شروع ہوگئی۔ ہوا کی تیزی اور شدت میں اضافہ ہوتا گیا۔ دس بجے رات یہ عالم تھا کہ بجلی کڑک رہی تھی۔ بادل گرج رہے تھے۔ منہ زور آندھی چل رہی تھی اور دھواں دھار بادل نے طوفان مچا رکھا تھا۔ برسات کا موسم تھا۔ لوگوں نے بارش سے لدے ہوئے بادلوں کا خیر مقدم کیا لیکن جب بارش نے اندھیر مچا دیا اور بجلی کے کوڑے شہر پر برسنے لگے تو لوگوں کے اوسان خطا ہو گئے۔ بچے ماؤں کے ساتھ لگ گئے ۔ بڑے بوڑھے دعائیں مانگنے لگے۔ اس بارش اور آندھی کے زور کو دیکھ کر یہ احساس ہو رہا تھا کہ سارا شہر اس طوفان میں بہہ جائے گا۔

میر عصمت اللہ مینیجر سٹی بنک اس وقت اپنے دفتر میں بیٹھے تھے جب ہلکی ہلکی بوندا باندی شروع ہوئی۔ ان کے ساتھ ان کا سیکرٹری بھی تھا۔ دفتر کا کچھ کام کافی عرصہ سے التوا میں چلا آ رہا تھا۔ میر صاحب آج شام تک دفتر میں بیٹھ کر اسے ختم کرنا چاہتے تھے۔ میر صاحب ادھیڑ عمر کے آدمی تھے۔ کوئی پچاس سے اوپر عمر ہوگی۔ بڑے خوش پوش اور خوش وضع آدمی تھے۔ گورا چٹا رنگ تھا۔ بدن مضبوط تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ جوانی میں کسرت کرتے رہے ہیں۔ بال ابھی کچھ کچھ ہی سفید ہوئے تھے۔ مونچھیں چھوٹی چھوٹی تھیں۔ ناک تیکھی اور آنکھیں چمکدار تھیں۔ بوسکی کی پوری آستینوں کی قمیض پر سونے کے بٹن لگے ہوئے تھے۔ پتلون سفید تھی اور پاؤں میں پشاوری چپل پہن رکھی تھی۔

میر صاحب کی جوانی بڑے عیش و عشرت کے ہنگاموں میں گزری تھی۔
ساغر و مینا بھی لنڈھائے تھے اور رقص و سرور کی محفلیں بھی برپا کی تھیں لیکن اس عمر میں آ کر جب کہ بیٹا جوان ہوگیا تھا انہوں نے گوشہ نشینی اختیار کر لی تھی۔ گزشتہ اٹھارہ انیس برس

ے اس بنک میں ملازم تھے۔ پہلے اکاؤنٹس کلرک تھے۔ پھر اکاؤنٹس افسر ہوگئے اور ترقی کرتے کرتے بنک مینیجر ہوگئے۔ دفتر میں ان کے اعلیٰ کام اور ایمانداری کا بڑا چرچا تھا۔ ہر ایک سے خندہ پیشانی سے ملتے۔ کبھی کسی ملازم کو شکایت کا موقع نہیں دیا تھا۔

بنک والوں نے میر صاحب کو معقول تنخواہ کے علاوہ ایک کوٹھی بھی دے رکھی تھی جو شہر سے باہر ایک پرسکون سڑک پر درختوں میں گھری ہوئی تھی۔ یہاں میر صاحب اپنی بیگم، اکلوتے بیٹے اسلم اور اپنے مرحوم بھائی کی بیٹی سلمہ کے ساتھ رہتے تھے۔ دو خادم تھے۔ ایک چھوٹی سی کار تھی۔ اسلم بی۔ اے کرنے کے بعد کامرس کی تیاری کر رہا تھا۔ سلمہ کے ماں باپ مرچکے تھے اور وہ اپنے چچا کے گھر میں ہی رہتی تھی۔ میر صاحب اور انکی بیگم کا خیال تھا کہ سلمہ کی شادی اسلم سے کر دی جائے۔ یہ مختصر سا کنبہ بڑے سکون اور اطمینان کے ساتھ زندگی بسر کر رہا تھا جس میں سوائے نوکروں کے وقت پر کبھی کوئی چیز نہ لا سکنے کے اور کوئی الجھن پیدا نہ ہوئی تھی۔

طوفان کی اس رات کو جس کا ہم ذکر کر رہے ہیں میر صاحب اپنے دفتر میں سیکرٹری کے ساتھ بیٹھے کام کرتے رہے۔ دفتر کا سارا عملہ جا چکا تھا۔ بنک کے تمام دروازوں پر تالے پڑ گئے تھے۔ باہر چوکیدار گیٹ کے آگے چارپائی ڈالے اس پر لیٹا حقہ پی رہا تھا۔ صرف عقبی دروازہ کھلا تھا۔ کوئی نو بجے رات میر صاحب نے کام ختم کر لیا۔ سیکرٹری نے تمام فائلیں اٹھا کر الماری بند کر دی۔ سیکرٹری اجازت لے کر اپنے گھر کی طرف چل دیا۔ میر صاحب نے گھر فون کر کے انہیں گاڑی بھجوانے کو کہا اور خود میز پر ٹانگیں رکھ کر سگریٹ سلگا لیا۔

جب انہیں انتظار کرتے کرتے پندرہ منٹ گذر گئے تو انہوں نے ایک بار پھر گھر فون کیا۔ ادھر سے بیگم نے کہا:

"گاڑی تو بھجوا دی گئی ہے"

"لیکن دفتر ابھی تک نہیں آئی"

"خدا خیر کرے۔ بارش بھی تو ہو رہی ہے۔ آپ ٹیکسی لیکر آ جائیے"

"اب تو یونہی کرنا پڑیگا۔ اچھا میں آ رہا ہوں"

انہوں نے فون بند کیا اور چوکیدار کو بلا کر چلنے ہی لگے تھے کہ فون کی گھنٹی بجی۔ میر صاحب نے رسیور اٹھایا۔ یہ ان کا ڈرائیور تھا۔

"ارے کیا بات ہو گئی تھی ؟"

ڈرائیور نے بتایا کہ راستے میں گاڑی ایک جگہ پانی کے گڑھے میں پھنس گئی اور اسے مزدور لگا کر نکالنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ میر صاحب نے کہا:

"تم گاڑی نکال کر گھر لے جانا۔ میں ٹیکسی پر آ رہا ہوں"

بنک سے باہر میر صاحب نے دیکھا کہ واقعی بارش خوب ہو رہی تھی اور بادل گرج رہا تھا اور بجلی بار بار چمک رہی تھی۔ ہوا بھی بڑی تیز چل رہی تھی۔ سڑک پر بہت کم لوگ دکھائی دے رہے تھے۔ انہوں نے قریباً نصف گھنٹے تک وہاں رک کر تانگے کا انتظار کیا۔ مگر وہاں کوئی بھی سواری نظر نہیں آ رہی تھی ـ۔ تھک ہار کر انہوں نے برساتی پہنی اور بارش میں پیدل ہی اپنے گھر کی طرف چل پڑے جوں جوں وہ آگے بڑھتے جا رہے تھے بارش کا طوفان زیادہ شدت اختیار کرتا چلا جا رہا تھا۔ ہوا آندھی کی صورت اختیار کر رہی تھی۔ درخت دیوانوں کی طرح جھوم رہے تھے۔ بارش زیادہ تیز ہو گئی تھی۔ بجلی بڑی غضبناک انداز میں کوندنے لگی تھی۔ تمام سڑکوں پر پانی کھڑا ہونے لگا تھا۔ سڑک اور نالے میں تمیز کرنا مشکل ہوگیا تھا۔ میر صاحب پھونک پھونک کر قدم رکھتے گھر کی طرف چلے جا رہے تھے۔ دو تین سڑکوں پر سے گزر کر وہ ایک چوک عبور کرنے لگے تو ایک تناور درخت جڑوں سے اکھڑ کر دھڑام سے ان کے سامنے فٹ پاتھ پر گرا۔ میر صاحب فوراً ایک طرف ہٹ گئے۔

وہ پھر اس طوفان میں آہستہ آہستہ چل پڑے، لیکن اب چلنا مشکل ہو رہا تھا اور خطرناک بھی تھا۔ کیونکہ کوئی پتہ نہ تھا کہ کب کون سا درخت فٹ پاتھ پر دھڑام سے گرے۔ مگر سوائے چلتے رہنے کے اور کوئی چارۂ کار بھی نہیں تھا۔ سڑک ویران پڑی تھی۔ جا بجا پانی کھڑا ہو گیا تھا۔ میر صاحب ایک جگہ تھوڑی دیر کے لئے رک گئے۔ ابھی وہ سوچ ہی رہے تھے کہ اچانک ان کے قریب ہی ایک پیپل کا درخت کڑکڑاتا ہوا جڑ سے اکھڑ کر آندھی کے زور سے سڑک پر گر پڑا۔ میر صاحب فوراً ایک طرف کو جھک گئے۔ لیکن درخت کی ایک شاخ ان کی پیشانی سے ٹکرا کر ان کی برساتی سے رگڑتی ہوئی چلی گئی۔ برساتی پھٹ گئی اور پیشانی سے خون جاری ہو گیا۔ میر صاحب نے جیب سے رومال نکال کر ماتھے پر رکھ لیا مگر خون تیزی سے نکل رہا تھا۔ انہوں نے ادھر ادھر دیکھا۔ پاس ہی ایک چھوٹی سی کوٹھی تھی جس کے بند روشندانوں پر بجلی کی روشنی جھلک رہی تھی۔ میر صاحب فوراً اس طوفان میں کوٹھی کی طرف بڑھے اور انہوں نے، برآمدے میں جا کر گھنٹی بجا دی۔ ایک ملازمہ نے دروازہ کھولا۔

"کس سے ملنا ہے ؟"

میر صاحب نے کہا:

"طوفان نے راستے میں گھیر لیا ہے۔ درخت گرنے کی وجہ سے زخمی بھی ہو گیا ہوں۔ کیا چند منٹ یہاں آرام کر سکتا ہوں ؟"

اس سے پہلے کہ ملازمہ کوئی جواب دے، پیچھے سے کسی دل کش نسوانی آواز نے کہا:

"آ جائیے، اندر آ جائیے"

میر صاحب اندر داخل ہوگئے۔ کمرے میں قالین بچھا تھا۔ سرخ صوفے پڑے تھے۔ دیواروں پر نیم عریاں عورتوں کی تصویریں تھیں۔ الماریوں میں چینی کے برتن سج رہے تھے۔ کمرہ بڑا پر تکلف اور قرینے سے سجا ہوا تھا۔ ایک انتہائی خوبصورت اور بھرے بھرے جسم کی گوری چٹی صحت مند عورت بیش قیمت سرخ ساڑھی میں ملبوس دیوان پر لیٹی کوئی کتاب پڑھ رہی تھی۔ اس نے میر صاحب کے ماتھے کو دیکھ کر کہا:

"ارے! آپ کی پیشانی سے خون بہہ رہا ہے۔ کیا ہوا تھا؟"

میر صاحب نے سارا واقعہ سنا دیا۔ اس عورت نے اٹھ کر ملازمہ سے ڈیٹول اور روئی لانے کو کہا۔ پھر میر صاحب کو کرسی پر بٹھلا کر خود میر صاحب کی پیشانی کا زخم دھویا۔ ڈیٹول کا پھاہا رکھا اور پٹی کر دی۔ اس دوران میر صاحب اس کے جسم کی خوشبو سے معطر ہوتے رہے۔ وہ ان کے بالکل قریب کھڑی تھی اور ساڑھی کے باوجود تجربہ کار اور پرانے عیاش میر صاحب کو اس صحت مند، دراز قد حسین عورت کے جسم کا ایک ایک خط عریاں دکھائی دے رہا تھا۔

ملازمہ ڈیٹول وغیرہ لے کر دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ وہ عورت سامنے صوفے پر بیٹھ گئی۔ میر صاحب نے پوچھا۔

"کیا آپ کے ہاں فون ہے؟"

"جی نہیں ـــ ابھی نہیں لگا۔"

میر صاحب کو معلوم تھا کہ گھر والے ان کے لئے بھی پریشان ہو رہے ہوں گے مگر وہ سوائے صبر سے بارش کے طوفان کے رکنے کا انتظار کرنے کے اور کیا کر سکتے تھے؟

اس عورت نے اپنا تعارف خود ہی کرواتے ہوئے کہا:

"میرا نام نجمہ ہے اور آپ کا ـــ؟"

"میر عصمت اللہ ـــ مینیجر سٹی بنک۔"

"اوہو! آپ کو تو پھر بڑی تکلیف ہوئی ہو گی۔"

"جی نہیں۔ ہاں اگر آپ مجھے اندر نہ بلاتیں تو شاید پریشانی اٹھانی پڑتی۔"

نجمہ نے مسکرا کر کہا:

"یہ تو آپ کا اپنا گھر ہے۔"

میر صاحب نے دیکھا کہ نجمہ کا جسم بڑا پُر کشش تھا اور نیلی آنکھوں میں بلا کی چمک اور جادو تھا۔ اس نے بالوں کے جوڑے میں موتیے کا ہار لپیٹ رکھا تھا۔ گوری گوری بھرپور بانہوں میں سرخ چوڑیاں تھیں اور ان کے مساموں سے چاندی کی کرنیں سی پھوٹ رہی تھیں۔ میر صاحب کو اپنی عشق بازیوں کے ہنگامے یاد آگئے۔ انہوں نے ایک عشرت پسند آدمی کی آنکھ سے نجمہ کو

دیکھا۔ انہیں یوں لگا جیسے وہ ایک دم جوان ہو گئے ہیں اور اب کبھی بوڑھے نہیں ہوں گے۔ جب انکی تیمارداری ہوچکی تو انہوں نے سگریٹ جلا لیا۔ اور نجمہ کی طرف دیکھ کر پوچھا:

"کیا آپ یہاں اکیلی رہتی ہیں؟"

نجمہ نے بڑے شیریں لہجے میں مسکرا کر کہا:

"کیا ایک عورت اکیلی نہیں رہ سکتی؟"

میر صاحب ہنس دیئے۔ انہیں نجمہ کی یہ بات بڑی خوبصورت لگی تھی اور اس میں ایک خاص قسم کی آوارہ زندگی کا اشارہ تھا۔ جس سے میر صاحب بخوبی واقف تھے۔ انہوں نے نجمہ کی آنکھیں میں آنکھیں ڈال کر کہا:

"کیوں نہیں ـــ آپ ایسی عورت جس قسم کی چاہے، زندگی بسر کر سکتی ہے لیکن میرا پوچھنے کا مقصد صرف یہ تھا کہ آیا آپ کے بچے بھی یہیں رہتے ہیں؟"

نجمہ قہقہہ لگا کر ہنس پڑی۔

"بچے انسانی کمزوریوں کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ وہ عورت کے حسن اور شباب کے دشمن ہوتے ہیں۔ میں نے اسی لئے شادی نہیں کی۔ میں اپنے حسن کو تادیر زندہ رکھنا چاہتی ہوں۔"

اب باہر بارش اور آندھی کا طوفان تھم گیا تھا۔ بارش کی شدت ختم ہو گئی تھی اور ہوا بھی ہلکی ہو گئی تھی۔ رات کافی گزر گئی تھی۔ جب میر صاحب اٹھنے لگے تو نجمہ نے کہا:

"اگر آپ کو زحمت نہ ہو تو یہیں سو جایئے۔ رات تھوڑی باقی رہ گئی ہے۔"

میر صاحب نے کہا:

"شکریہ! گھر میں میری بیوی پریشان ہو گی۔"

نجمہ ہنس پڑی اور آنکھیں جھپکا کر بولی!

"جب تو آپ کو ضرور گھر پہنچنا چاہئے۔ میں جانتی ہوں بیوی کیا ہوتی ہے۔"

جب میر صاحب نجمہ کا بہت بہت شکریہ ادا کر کے باہر نکلے تو نجمہ نے کہا:

"امید ہے آپ پھر بھی کبھی ادھر ضرور تشریف لائیں گے۔"

"ہاں اگر طوفان آیا تو۔"

"آپ آ جایئے، طوفان اپنے آپ آ جائے گا۔"

دونوں ہنس پڑے۔ اس بے تکلفی سے گویا وہ برسوں سے ایک دوسرے کے آشنا ہوں۔ نجمہ نے ڈرائیور کو حکم دیا کہ وہ میر صاحب کو ان کے گھر تک چھوڑ آئے۔ میر صاحب گاڑی میں بیٹھ گئے اور گاڑی ان کے گھر کی طرف روانہ ہو گئی۔ سارا راستہ نجمہ کی پراسرار الف لیلوی شخصیت کے بارے میں سوچتے رہے۔ ان کا جی چاہا کہ وہ ہر رات اسی خوبصورت پراسرار عورت کی

معیت میں بسر کریں۔ اس کی نیلی نیلی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اسے دیکھتے رہیں اور اس کی پیاری پیاری شیریں باتیں سنتے رہیں۔

ادھر جو میر صاحب کو لے کر گاڑی نجمہ کی کوٹھی سے باہر نکل گئی تو نجمہ واپس کمرے میں آکر صوفے کے پاس کھڑی ہو گئی اور ایک الماری سے شب خوابی کا لباس نکالنے لگی۔ اتنے میں دوسرے کمرے کا پردہ اٹھا اور ایک نوجوان جس کا چہرہ پختہ اور مونچھیں چھوٹی چھوٹی تھیں اور جس نے نیلی قمیض کے ساتھ سفید پتلون پہن رکھی تھی، منہ میں سگریٹ دبائے اندر آیا اور نجمہ کے شانوں پر ہاتھ رکھ کر بولا:

"تم نے گھر آئے ہوئے شکار کو آخر پھانس لیا۔ تم بڑی ہوشیار ہو نجمہ اور پیاری بھی۔"

نجمہ نے منہ پھیر کر مسکرا کا نوجوان کو دیکھا۔

"پرویز! ہم دونوں بڑے پیارے اور ہوشیار ہیں۔"

"تم نے بڑی دانش مندی کا جال پھینکا ہے۔ مچھلی پھنس گئی ہے مگر اسے کنارے تک لانے کیلئے دوہری دانشمندی اور ہوشیاری کی ضرورت ہے۔"

"فکر نہ کرو پرویز! میں پرانی شکاری ہوں۔ میر عصمت اللہ مینیجر سٹی بنک میرے ہاتھ سے بچ کر نہیں جا سکتا۔"

پرویز نے سگریٹ کا کش لے کر کہا:

"تمہیں معلوم ہے۔ ہمیں ان دنوں روپے کی سخت ضرورت ہے۔ کلب کا دھندہ گھاٹے میں جا رہا ہے۔ گورنمنٹ نے شراب کا لائسنس دینے سے انکار کر دیا ہے۔ ہمیں چوری چھپے یہ کام کرنا پڑتا ہے۔ اس میں خطرہ زیادہ اور منافع کم ہو جاتا ہے۔"

"گھبراؤ نہیں پرویز! کوئی دن کی بات ہے کہ سٹی بنک کا روپیہ ہمارے کلب میں آنا شروع ہو جائے گا۔"

پرویز نے خوشی سے نجمہ کا منہ چوم لیا۔ دونوں نے وائن کا ایک ایک گلاس بھرا اور اٹھا کر پی گئے۔ نجمہ نے کہا:

"میرا سر درد کر رہا ہے۔ میں سونے چلی۔"

"شب بخیر۔"

"شب بخیر۔"

پرویز اپنے کمرے میں چلا گیا۔ نجمہ شب خوابی کا لباس لے کر دوسرے کمرے میں آ گئی۔ یہاں آکر اس نے ساڑھی اتار کر اسے تہہ کر کے الماری میں رکھا۔ پھر زیر جامہ کرسی پر پھینکا۔ اپنے عریاں جسم کو آئینے میں غور سے دیکھا۔ بالوں کا جوڑا کھول کر موتیئے کا ہار باہر نکالا۔ شب خوابی کا

نصف کرتہ اور پاجامہ پہنا اور اپنے پلنگ پر لیٹ کر بتی گل کر کے سونے کی کوشش کرنے لگی۔

باہر دور کبھی کبھی بجلی چمک جاتی تھی لیکن بادلوں کی گرج بالکل سنائی نہیں دے رہی تھی۔ بارش بڑی خاموشی سے آہستہ آہستہ ہو رہی تھی۔ نجمہ آنکھیں بند کئے کچھ دیر تک رات کے واقعات پر غور کرتی رہی۔ پھر اسے نیند آ گئی۔

میر صاحب جس وقت گھر پہنچے تو ان کی پریشان حال بیگم نے اطمینان کا سانس لیا۔ اس نے کہا:

"میں نے سوا پانچ کی نیاز دلوانی کر لی تھی۔ خدا کا شکر ہے کہ آپ گھر آئے۔ میرا تو پریشانی کے مارے دم سوکھ رہا تھا۔ آخر ہو کیا گیا؟"

میر صاحب نے ڈرائیور کے گاڑی میں پھنسا دینے، خود پیدل چلنے اور پھر معمولی زخمی ہونے اور ایک دوست کے ہاں چلے جانے کی ساری کہانی سنا ڈالی۔

بیگم نے جلدی سے پانی کی بوتل گرم کر کے ماتھے پر اس کی ٹکور کی۔ میر صاحب نجمہ کی کوٹھی والا حصہ ہضم کر گئے تھے۔ انہوں نے اپنی بیوی کو نجمہ کا قصہ بیان کرنا مناسب خیال نہ کیا۔ سلمہ بیچاری بھی اس وقت تک جاگ رہی تھی۔ اسلم اپنے اوپر والے کمرے میں سو رہا تھا۔ میر صاحب نے بیگم اور سلمہ کے ساتھ مل کر تھوڑا سا کھانا کھا لیا۔ کیونکہ وہ دونوں ابھی تک بھوکی تھیں اور اپنے کمرے میں جا کر سو گئے۔ ان کی بیگم ان کے پاس ہی دوسرے پلنگ پر لیٹ گئیں۔ کچھ دیر دونوں ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے۔ پھر وہ بھی سو گئے۔ میر صاحب کچھ دیر تک نجمہ کے بارے میں دل کش خواب دیکھتے رہے۔ کبھی انہیں یوں لگے جیسے ان کی رنگین جوانی نجمہ کے روپ میں میں انہیں ملنے آئی ہے۔ کبھی یوں محسوس ہو جیسے وہ نجمہ کے گلے میں بانہیں ڈالے ایک پُر فضا باغ کی روش پر سیر کرتے پھر رہے ہیں۔ چاروں طرف گلاب کے پھول ڈھیروں کھل رہے ہیں۔ ہوا خوشگوار ہے۔ دونوں ایک دوسرے کی طرف دیکھ دیکھ کر مسکرا رہے ہیں اور کبھی ایک دوسرے کا منہ بھی چوم لیتے ہیں۔ اس قسم کے رنگین تصور سے میر صاحب خواب گاہ کے اندھیرے میں آنکھیں بند کئے مسکراتے رہے۔

پھر انہیں بھی نیند آ گئی۔ خواب میں انہوں نے واقعی نجمہ کے کندھے پر ہاتھ رکھے اپنے آپ کو ایک الف لیلوی تاج محل کے باغ میں محو خرام دیکھا۔ نجمہ نے وہی سرخ ساڑھی پہن رکھی تھی اور بالوں میں موتیئے کا سفید ہار لگا تھا۔ اس کی آنکھیں چمک رہی تھیں اور وہ مسکرا مسکرا کر میر صاحب کی طرف دیکھ رہی تھی۔ پھر اچانک آسمان پر بادل چھا گئے اور ایک دم بارش شروع ہو گئی۔ آندھی چلنے لگی۔ دونوں بھاگ کر ایک درخت کے نیچے آ گئے۔ یکلخت وہ درخت دھڑام سے گر پڑا اور میر صاحب ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھے۔ انہوں نے اندھیرے میں دیکھا دوسرے پلنگ پر ان کی

بیگم بڑے سکون سے سو رہی تھی اور کھلی کھڑکی میں سے نصف چاند کی ہلکی ہلکی روشنی اندر آرہی تھی۔

دوسرے روز صبح میر صاحب مینیجر سٹی بنک اپنے دفتر کے کمرے میں بیٹھے بعض اہم کاغذات پر دستخط کر رہے تھے کہ فون کی گھنٹی بجی۔ میر صاحب نے اپنے دھیان میں رسیور اٹھا کر کہا:

"یس۔"

ادھر سے دل کش نسوانی آواز آئی:

"میر صاحب بول رہے ہیں کیا؟"

میر صاحب کی توجہ کاغذات سے ہٹ گئی۔ انہوں نے کہا:

"جی ہاں! میں بول رہا ہوں۔ آپ کون ہیں؟"

نسوانی آواز نے مسکرا کر کہا:

"اتنی جلدی آپ نے بھلا دیا؟"

میر صاحب کچھ گھبرا گئے۔

"معاف کیجیے گا میں نے آپ کو پہچانا نہیں۔"

میر صاحب کو فوراً اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ یہ تو نجمہ فون پر ان سے ہمکلام تھی۔ انہوں نے معذرت چاہی اور کہا:

"دراصل نجمہ صاحبہ بات یہ ہے میں دفتری کام میں الجھا ہوا تھا۔ یہ تو آپ جانتی ہیں کہ بنک کا کام کتنا خشک اور ذمہ داری کا ہوتا ہے۔ وگرنہ یہ کبھی ہو سکتا ہے کہ میں اپنے محسن کو بھول جاؤں۔ کل والی رات تو مجھے زندگی بھر نہیں بھولے گی۔"

ادھر سے نجمہ کے قہقہے کی آواز آئی۔

"چلیے --- اب آپ باتیں بنانے لگے۔ اچھا ان باتوں کو چھوڑیے۔ کیا آج شام آپ کی خالی ہے؟"

"کیوں نہیں۔ آپ کہیں تو ہر شام خالی ہو سکتی ہے۔"

"شکریہ! پھر آپ شام کو میرے غریب خانے پر تشریف لائیے گا۔ پورے آٹھ بجے۔ میں انتظار کروں گی۔"

"یہ میرے لئے خوشی کی بات ہے کہ آپ مجھے دعوت دے رہی ہیں۔ میں ضرور حاضر ہوں گا۔"

"اچھا تو شام تک خدا حافظ۔"

"خدا حافظ۔"

میر صاحب نے فون بند کر دیا۔ خوشی کی ایک چمکیلی لہر ان کے چہرے پر ناچنے لگی۔ تو گویا آج شام پھر وہ خوبصورت پراسرار الف لیلوی دوشیزہ کی صحبت میں بسر کریں گے۔ اس سے بڑھ کر خوشی اور مسرت کی اور کیا بات ہو سکتی تھی۔ خیال ہی خیال میں انہوں نے اپنے آپ کو نجمہ کی کوٹھی میں پایا۔ وہ صوفے پر بیٹھے تھے۔ نیلی آنکھوں والی نجمہ ان کے سامنے سرخ ساڑھی پہنے نیم دراز تھی اور نیم وا آنکھوں سے انہیں دیکھ رہی تھی۔ سارا دن میر صاحب نجمہ سے ملاقات کی رنگینیوں کے خواب دیکھتے رہے۔ دوپہر کو وہ گھر چلے گئے اور کھانا کھا کر سو گئے۔ شام کو اٹھ کر انہوں نے چائے پی۔ کچھ وقت ادھر ادھر کی باتوں میں سلمہ اور اپنی بیگم کے ساتھ بسر کیا۔ انہوں نے اسلم کا پوچھا۔ بیگم نے کہا:

"اپنے دوستوں کے ساتھ ابھی ابھی گاڑی لے کر گیا ہے۔"

"گاڑی لے کر؟ اور میں اب اپنے ڈائریکٹر کے گھر کیسے جاؤں گا۔ وہاں میرا رات کو کھانا ہے۔"

"میرا خیال ہے وہ شام تک آجائے گا۔"

میر صاحب نے نفرت سے سر جھٹک کر کہا:

"وہ اتنا ذمہ دار ہوتا تو رونا کس بات کا تھا۔"

میر صاحب اٹھ کر نہانے کے لئے غسل خانے میں چلے گئے۔ سلمہ اور بیگم چپ چاپ بیٹھی رہیں۔ بیگم کو اس بات کا صدمہ تھا کہ اسلم کے لچھن اچھے نہیں تھے اور اس کا باپ اس سے ہمیشہ ناراض رہتا تھا۔ اسلم اپنی شامیں غلط قسم کے آوارہ مزاج دوستوں کے ساتھ بسر کرتا تھا اور اپنی ماں سے روپے مانگ مانگ کر انہیں عیاشیوں میں خرچ کر دیتا تھا۔ پڑھائی میں اس کا ذرا جی نہ لگتا تھا اور وہ محض نام رکھنے کے لئے کبھی کبھی رات کو پڑھنے بیٹھ جایا کرتا تھا۔ جب امتحان قریب آجاتے تو رٹائی کر کے کسی نہ کسی طرح دوسری کلاس میں چلا جاتا تھا۔

بیگم اور میر صاحب کا خیال سلمہ سے اسلم کی شادی کرنے کا تھا۔ سلمہ کو اس بات کا علم بھی تھا۔ سلمہ کو ہمارے عام شریف گھروں کی لڑکیوں کی طرح اسلم سے محبت ہوگئی تھی اس نے ابھی ہی سے اسے اپنا خیالی شوہر سمجھ لیا تھا لیکن اسلم نے کبھی سلمہ سے محبت کی کوئی بات نہ کی تھی بلکہ کبھی کبھی وہ سلمہ کے ساتھ ترش روئی سے پیش آتا تھا جسے سلمہ بڑی خندہ پیشانی سے سہ جاتی تھی۔ سلمہ بڑی محبت اور فرمانبرداری سے اسلم کی ہر بات کا خیال رکھا کرتی۔ اس کے کمرے کی الٹ پلٹ چیزوں کو ٹھیک کر دیا کرتی۔ اس کے گرے پڑے کپڑوں کو اٹھا کر دھوبن کے ہاں بھجوا دیتی۔ اس کی کتابوں کو قرینے سے شیلف میں لگا دیا کرتی۔ رات کو کبھی کبھی اس کے لئے دودھ بھی لے کر اس کے کمرے میں چلی جاتی مگر اسلم نے کبھی سلمہ سے زیادہ بات نہیں کی تھی۔ وہ

معمولی انداز میں اس سے ضروری بات کرتا اور پھر اپنے کام میں مصروف ہو جایا کرتا۔مگر سلمہ ان باتوں کا برا نہیں مانتی تھی۔ وہ اسلم سے بڑی خاموش اور گہری محبت کر رہی تھی۔ ایسی محبت جو خالص مشرقی ہوتی ہے اور جس میں قربانی اور ایثار کا جذبہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوتا ہے۔

میر صاحب بن سنور کر شام کو سات ساڑھے سات بجے بالکل تیار ہوگئے لیکن اسلم گاڑی لے کر ابھی واپس نہیں آیا تھا۔ آخر جو پونے آٹھ بجنے لگے تو میر صاحب کا پیمانۂ صبر لبریز ہو گیا اور انہوں نے ٹیکسی والے کو فون بھی کر دیا تو اسلم صاحب گاڑی لے کر کوٹھی میں داخل ہوئے۔

"جب تم گاڑی لے کر گھر سے نکلتے ہو تو یہ کیوں بھول جاتے ہو کہ کسی دوسرے کو بھی گاڑی کی ضرورت ہوگی۔"

اسلم نے کار میں سے باہر نکل کر دروازہ بند کرتے ہوئے کہا:

"بابوجی! میں ایک دوست کے ہاں دعوت پر گیا تھا۔ وہاں دیر ہوگئی۔"

میر صاحب نے غصے سے کہا:

"میں جانتا ہوں تم کیسی دعوتیں آج کل اڑا رہے ہو۔ میری طرف سے تم جہنم میں جاؤ مگر گاڑی واپس بھجوا دیا کرو۔"

میر صاحب گاڑی میں سوار ہوگئے اور اسلم بڑبڑاتا کوٹھی کے ہال روم میں داخل ہوگیا۔

میر صاحب نے ملازمہ سے کہا:

"ٹیکسی والا آئے تو اسے بیگم سے دو روپے لے کر دے دینا اور واپس کر دینا۔"

"اچھا بابوجی۔"

"چلو ڈرائیور۔"

میر صاحب نے اپنے ڈرائیور کو منزل مقصود کا بتایا اور نجمہ کے گھر کی طرف گاڑی روانہ ہوگئی۔ پورے آٹھ بج کر پانچ منٹ پر میر صاحب کی گاڑی نجمہ کی کوٹھی کے احاطے میں داخل ہوئی۔ میر صاحب نے ڈرائیور سے کہا:

"گاڑی واپس لے جاؤ اور سنو! کسی کو علم نہ ہو کہ میں اس کوٹھی میں آیا ہوں۔ یہی کہنا کہ میں بابوجی کو ڈائریکٹر صاحب کی کوٹھی میں چھوڑ کر آ رہا ہوں۔ سمجھے؟"

"جی بابوجی۔"

"اب تم واپس جاؤ۔ اگر ضرورت ہوئی تو میں فون کر کے تمہیں بلا لوں گا۔"

ڈرائیور گاڑی سٹارٹ کر کے کوٹھی کے دوسرے گیٹ میں سے باہر نکل گیا۔ میر صاحب برآمدے میں آ گئے۔ انہوں نے بوسکی کی دھلی دھلائی سونے کے بٹنوں والی قمیض اور شارک سکن کی سفید پتلون پہن رکھی تھی۔ پاؤں میں جودھ پوری جوتی تھی۔ بالوں میں خوشبو دار تیل لگا تھا۔

ہاتھ میں سونے کی انگوٹھی اور کپڑوں سے خس کے عطر کی مہک اٹھ رہی تھی۔ اس وقت وہ ادھیڑ عمر کا ایک عیاش آدمی معلوم ہو رہا تھا جسے خیال نہ ہو کہ اس کی جوانی بڑھاپے کی حدود میں داخل ہوگئی ہے۔

میر صاحب نے گھنٹی کا بٹن دبایا۔

کوئی ایک منٹ کے بعد خادمہ نے دروازہ کھول کر میر صاحب کو اندر بلالیا۔ میر صاحب ڈرائینگ روم میں آکر ایک صوفے پر بیٹھ گئے۔ یہ وہی کمرہ تھا جہاں کل رات انہوں نے زندگی کے کچھ خوبصورت لمحے بسر کئے تھے۔ ابھی انہیں وہاں بیٹھے بمشکل دو منٹ ہوئے ہوں گے کہ پردہ ہٹا اور نجمہ مسکراتی ہوئی کمرے میں داخل ہوئی۔ میرصاحب نے اٹھ کر نجمہ کو آداب عرض کیا۔ نجمہ نے مسکرا کر سلام کا جواب دیا اور کہنے لگی:

"آپ کو میرا مکان یاد رہا آواز تو آپ بھول گئے تھے۔"

میر صاحب نے شرمندہ سا ہو کر کہا:

"مجھے شرمندگی ہے مس نجمہ کہ میں مصروفیت کے باعث آپ کی آواز کو پوری طرح محسوس نہ کر سکا لیکن اس مکان کا دروازہ میں کیسے بھول سکتا ہوں جس نے مجھ پر نوازشوں کی بارش کی ہو۔"

"خیر یہ تو آپ تکلف کر رہے ہیں۔ میں نے کل رات جو کچھ کیا' وہ میرا فرض تھا۔ یہ بتائیے۔ آپ کیا پئیں گے۔ چائے' کافی یا ......"

یہاں پہنچ کر نجمہ چپ ہوگئی اور اس نے گہری نیلی آنکھوں سے میر صاحب کو دیکھ کر ایک الماری کا دروازہ کھول دیا۔ اندر شراب کی بوتلیں اور شیشے کے جام سجے ہوئے تھے۔

"معاف کیجے گا۔ آپ اس کا شوق کرتے ہیں کیا؟"

میر صاحب کھسیانے سے ہو کر مسکرائے اور بولے۔

آپ اگر اپنے ہاتھ سے زہر بھی پلا دیں تو میں شوق سے پی جاؤں گا۔"

"بہت خوب تو لیجئے زہر حاضر ہے۔"

"زہے قسمت!"

نجمہ نے ایک جام میں سکاچ وسکی ڈال کر اس میں تھوڑا سا سوڈا ملایا اور میر صاحب کے آگے رکھ دیا۔ میر صاحب بولے:

"ویسے آپ کے ہوتے ہوئے جام و مینا کی ضرورت نہیں رہتی۔"

نجمہ نے مسکرا کر دیکھا:

"آپ بڑی خوبصورت باتیں کرتے ہیں۔"

"خوبصورت ہستیوں کے سامنے میری زبان بھی خوبصورت ہو جاتی ہے۔"

نجمہ نے ایک پیگ اپنے لئے بنایا اور بولی:

"جام تجویز کیجئے۔"

میر صاحب نے آہستہ سے جام اٹھا کر کہا:

"طوفان کی ایک رات کے نام۔"

دونوں اپنا اپنا جام حلق میں انڈیل گئے۔ میر صاحب نے کوئی آٹھ سال کے بعد شراب کو ہاتھ لگایا تھا۔ ایک زمانہ تھا کہ وہ بلاناغہ رات کو دوستوں کے جھمگٹے میں شراب پیا کرتے تھے اور اتنی پی جایا کرتے تھے کہ انہیں اپنی سدھ بدھ نہ رہتی تھی۔ پھر انہوں نے یہ سب کچھ چھوڑ دیا اور صوفی ہوگئے۔ آج اتنی مدت بعد نجمہ کے سامنے بیٹھ کر پینے سے ان کے اندر وہی پرانی لذت بیدار ہوئی۔ پہلے ہی جام نے انہیں کافی مسرور کر دیا۔

نجمہ نے آج گلابی رنگ کی بڑی ہی شوخ پھول دار ساڑھی پہن رکھی تھی جس کا بارڈر سرخ ---- گہرے سرخ رنگ کا تھا۔ اس کا بلاؤز سیاہ اور ریشمی تھا۔ رنگوں کے تضاد نے اس کے خوبصورت اور گورے رنگ کو مزید نمایاں کر دیا تھا۔ دوسرے پیگ کے بعد نجمہ نے مسکرا کر میر صاحب سے کہا:

"میر صاحب! کھانا ہم کلب میں کھا رہے ہیں۔"

"کونسا کلب؟"

"کنگز کلب۔"

میر صاحب کے چہرے پر تھوڑی سی تشویش کے آثار پیدا ہوئے۔ وہ جانتے تھے کہ کنگز کلب شہر کا ایک بدنام لیکن بڑا مشہور کلب ہے اور وہاں بڑی اونچی سوسائٹی کے لوگ جایا کرتے ہیں۔ انہیں اس بات کا خیال ضرور تھا کہ کہیں وہاں انہیں کوئی واقف یا بیگم کا رشتے دار نجمہ کے ساتھ نہ دیکھ لے۔ نجمہ نے میر صاحب کو خاموش دیکھا تو بولی:

"کیوں آپ کو وہاں چلنے میں کوئی اعتراض ہے کیا؟"

میر صاحب نے مسکرا کر کہا:

"بھلا آپ کے ساتھ کہیں جانے میں کوئی اعتراض ہو سکتا ہے۔ بات صرف اتنی سی ہے کہ میں نے ایک مدت سے اس قسم کی محفلوں سے کنارہ کشی اختیار کر رکھی ہے۔ اس لئے ذرا محتاط ہو کر رہنا چاہتا ہوں۔ آپ تو جانتی ہیں مس نجمہ زمانہ بڑا نازک ہے۔ لوگوں کو دوسرے کی شہرت خراب کرنے کے لئے بس ایک بہانہ چاہیے۔"

"یہ بات ہے ---- لیکن آپ گھبرائیے گا نہیں۔ وہاں ہم ایسی جگہ چل کر بیٹھیں گے

کہ آپ کو کوئی نہیں دیکھے گا۔ بات یہ ہے کہ کنگز کلب میرے ایک رشتہ دار کی ملکیت ہے۔ مجھے وہاں ہر طرح کی سہولت میسر ہے۔"

تو پھر چلئے۔ میں انکار کرنے کی جرأت کر سکتا ہوں؟"

"فکر نہ کیجئے گا۔ آپ کی عزت میری عزت ہے۔"

اس کے بعد میر صاحب اور نجمہ کوٹھی کے کمرے سے باہر نکل آئے۔ باہر آکر وہ گاڑی میں سوار ہوئے۔ نجمہ خود کار ڈرائیو کر رہی تھی۔ شہر کی سب سے بڑی شاہراہ پر سے گاڑی گزر رہی تھی۔ دونوں جانب عمارتوں اور سجی سجائی دوکانوں کے اندر روشنیاں ہو رہی تھیں۔ ایک جگہ سے گاڑی رخ پھیر کر مشرقی علاقے کی طرف روانہ ہوگئی۔ یہاں نہایت اعلیٰ اور شاندار کوٹھیوں اور باغات کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ کافی دور جانے کے بعد نجمہ نے ایک بڑی پراسرار اور پر شکوہ کوٹھی کے عقب میں جاکر گاڑی کھڑی کر دی۔

"میرے ساتھ ساتھ چلے آیئے۔"

نجمہ نے پچھلی طرف سے ایک دروازہ کھولا اور ایک برآمدے میں سے گزر کر سیڑھیاں چڑھنے لگی۔ سیڑھیاں پتھر کی تھیں اور تنگ تھیں۔ سیڑھیاں چڑھ کر دونوں ایک گیلری میں آگئے۔ جہاں تین چار خوبصورت میزیں لگی تھیں اور پاس ہی خوشنما گدے دار سرخ کرسیاں پڑی تھیں۔ نجمہ نے فوراً پیڈسٹل فین چلا دیا۔

آپ یہاں تشریف رکھیں۔ میں ابھی آئی

نجمہ چلی گئی۔ میر صاحب نے گیلری میں سے ذرا جھانک کر نیچے دیکھا۔ نیچے کئی ایک لوگ میزوں کے گرد بیٹھے کافی یا شراب پی رہے تھے۔ ان کے ساتھ خوبصورت کپڑوں والی عورتیں بھی تھیں۔ چھت پر برقی قمقموں کے جھاڑ روشن تھے اور روشنی میں ان عورتوں کے زیورات اور ہیرے چمک رہے تھے۔ فضا میں کافی اور سگریٹ اور شراب اور عورتوں کے عطریات کی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔

تھوڑی ہی دیر میں ایک خوش پوش بیرے نے آکر میر صاحب کی میز پر شراب کی بوتل اور بلوریں جام رکھ دیئے اور چپکے سے سر جھکا کر واپس چلا گیا۔ میر صاحب کو ہلکا ہلکا سا سر درد پہلے ہی ہو رہا تھا۔ وہ زیادہ پینا نہیں چاہتے تھے مگر ان کے اندر کا پرانا شرابی اور عیاش آدمی اپنی برسوں کی کٹیا سے پھر سے باہر نکل آیا تھا اور مزید شراب مانگ رہا تھا۔ اتنے میں وہاں نجمہ بھی آگئی۔ اس کے ساتھ پرویز بھی تھا۔ پرویز نے ڈنر سوٹ پہن رکھا تھا اور مونچھوں پر عطر ملا ہوا تھا۔ اس نے بڑی مکارانہ مسکراہٹ کے ساتھ میر صاحب سے ہاتھ ملایا۔ نجمہ نے تعارف کروایا۔

"میر صاحب یہ میرے کزن پرویز ہیں ۔ کنگز کلب انہی کے دم سے چل رہا ہے اور یہ میر صاحب ہیں سٹی بنک کے مینیجر۔"

"آپ سے مل کر بڑی خوشی ہوئی ۔"

"مجھے بھی آپ سے مل کر بڑی خوشی ہوئی ہے ۔"

پرویز اور نجمہ میر صاحب کے ساتھ بیٹھ گئے ۔ نجمہ نے میر صاحب اور پرویز کو شراب پیش کی۔

میر صاحب بولے :

"میرا خیال ہے مجھے نہیں پینی چاہیے ۔"

نجمہ نے مسکرا کر پوچھا :

"کیوں ؟ کیا آپ تین پیگ بھی نہیں اٹھا سکتے ؟"

میر صاحب کے اندر پرانے شرابی کو غیرت آگئی ۔ انہوں نے نجمہ کے ہاتھ سے جام لیکر ایک ہی گھونٹ میں چڑھا لیا ۔ نجمہ اور پرویز کچھ حیران سے ہوگئے ۔ پرویز نے معنی خیز انداز سے نجمہ کو دیکھا۔ نجمہ نے ہنس کر کہا :

"میر صاحب بڑے پیارے آدمی ہیں پرویز ! یہ ساتھ ہوں تو آدمی کبھی زندگی سے مایوس نہیں ہوتا ۔ پھر انسان کو یوں محسوس ہوتا ہے جیسے زندگی ایک سہانا خواب ہے جو کبھی ختم نہیں ہوگا۔"

میر صاحب نے مسکرا کر کہا :

"میرا خیال ہے یہ باتیں مجھے آپ کے متعلق کہنی چاہیے تھیں ۔ کیونکہ درحقیقت آپ کے ساتھ رہ کر زندگی کی خوبصورتی اور پائیداری کا احساس ہوتا ہے ۔"

چوتھے پیگ کے بعد میر صاحب کو پورا نشہ ہوگیا لیکن چونکہ ایک عرصے سے وضع داری کی مشق کر رکھی تھی اس لئے بڑی سنجیدگی سے بیٹھے باتیں کرتے رہے اور نجمہ کی ہر بات کا طریقے سے جواب دیتے رہے ۔ پرویز جا چکا تھا ۔ نجمہ کو بھی نشہ ہوگیا تھا مگر وہ بڑے موڈ میں تھی اور ہنس ہنس کر میر صاحب سے باتیں کر رہی تھی اور جوانی اور شباب کی تعریف میں پرانے شاعروں کے اشعار پڑھنے لگی تھی ۔

کھانا بڑا پر تکلف بنایا گیا تھا ۔ دنیا کی ساری نعمتیں رکابیوں میں جمع کر دی گئی تھیں ۔ کھانے پر پرویز نے بھی ان لوگوں کا ساتھ دیا ۔ میر صاحب نے بڑی رغبت سے کھانا کھایا ۔ نجمہ ان کے بالکل ساتھ ہی بیٹھی تھی اور ایسے ہوتا تھا کہ جب وہ نوالہ منہ میں ڈالنے کے لئے چمچ اٹھاتے تو کئی بار ان کی کہنی نجمہ کی گداز بازو سے چھو جاتی ۔ وہ معذرت کرتے ۔ نجمہ مسکرا کر کہتی :

"یہ تو خوشی کی بات ہے ۔"

کھانے کے بعد پرویز اجازت لیکر رخصت ہوگیا ۔ اب وہاں نجمہ اور میر صاحب اکیلے رہ گئے۔ نجمہ نے وائن کا مزید ایک ایک پیگ منگوا کر خود بھی پیا اور میر صاحب کو بھی مجبور کر کے پلا دیا ۔ بہترین شراب اور بہترین کھانے کے بعد میر صاحب کی پرانی زندگی اور پرانی شخصیت واپس آگئی ۔ انہوں نے نجمہ کا ہاتھ تھام کر اسے چوم لیا اور جیب سے سونے کی انگوٹھی نکال کر اس کی انگلی میں ڈال دی ۔ نجمہ نے بڑی خوشی سے انگوٹھی کو دیکھا اور بولی :

"یہ تکلف آپ نے کیوں کیا ؟"

"یہ میری خوشی کا معاملہ ہے ۔ میں نے بڑی محبت سے یہ حقیر تحفہ پیش کیا ہے ۔"

نجمہ نے انگوٹھی کو غور سے دیکھا ۔ سونے کی خوبصورت اور موٹی انگوٹھی جس کے وسط میں سرخ نگینہ جھلملا رہا تھا ۔ نجمہ نے انگوٹھی کو چوم لیا ۔

"یہ نشانی میری زندگی کے ساتھ پرانے دنوں کی یاد بن کر رہے گی ۔"

میر صاحب نجمہ کے منہ سے اس قسم کے محبت آمیز جملے سنکر کچھ جذباتی سے ہوگئے۔ انہوں نے ایک بار پھر نجمہ کا ہاتھ چوم لیا اور پھر ذرا آگے بڑھ کر چاہتے تھے کہ نجمہ کے رخسار پر بوسہ دیں کہ نجمہ کھسک کر پرے ہوگئی اور بولی۔

"کوئی دیکھ لے گا۔"

میر صاحب فوراً پیچھے ہٹ گئے ۔ انہیں خیال آگیا واقعی کہیں کوئی انہیں دیکھ نہ لے مگر نشے میں عقل کی سرحد سے آگے گذر گئے تھے ۔ فوراً اپنی جگہ پر واپس آگئے لیکن نجمہ کا حسن اور بھرپور جسم ان کے اندر آگ لگائے ہوئے تھا ۔ وہ تو چاہتے تھے کہ نجمہ کو اپنے ساتھ لگا کر بھینچ ڈالیں ۔ بالکل اسی طرح جس طرح وہ کبھی عیاش طوائفوں کے ساتھ کیا کرتے تھے ۔ نجمہ نے سگریٹ سلگایا ۔ میر صاحب نے دیکھا لائٹر کے شعلے میں نجمہ کا گول گول سرخ سفید چہرہ انار کی طرح دمک رہا تھا ۔ اس کے کپڑوں میں سے عطر کی خوشبو کی لہریں اٹھ رہی تھیں ۔ جب وہ چلنے کیلئے اٹھے تو میر صاحب نے ایک بار پھر نجمہ کا ہاتھ تھام لیا۔

"میں کس زبان سے آپ کی محبت اور مہمان نوازی کا شکریہ ادا کروں؟ مجھے الفاظ نہیں مل رہے۔"

نجمہ نے مسکرا کر کہا :

"شکریہ کی کیا ضرورت ہے میر صاحب۔"

میر صاحب نے نجمہ کا ہاتھ نہ چھوڑا اور نہ ہی نجمہ نے ہاتھ چھڑانے کی کوشش کی ۔ میر صاحب نے ذرا آگے بڑھ کر نجمہ کے گداز بازوؤں پر ہاتھ رکھ دیئے ۔ انہیں یوں لگا جیسے ان کے

بدن میں نجمہ کے جسم کی گرمی اور گداز پن سرایت کر رہا ہے ۔ نجمہ بت سی بنی میر صاحب کو دیکھ کر مسکراتی رہی اور اپنی تیز اور گہری نگاہوں سے بجلیاں گراتی رہی ۔ میر صاحب نے آہستہ سے نجمہ کو اپنی طرف کھینچا ۔ قریب تھا کہ دونوں کے جسم ایک دوسرے سے مل جائیں کہ نجمہ ایک دم سے پرے ہٹ گئی۔

"ہائے کوئی آرہا ہے۔"

سیڑھیوں پر کسی کے قدموں کی آواز آئی اور پھر غائب ہو گئی ۔ کوئی دوسری طرف والی گیلری کی طرف چلا گیا تھا ۔ میر صاحب بڑے جھنجلائے ۔ انہوں نے نجمہ سے کہا۔

"اس سے تو بہتر تھا ہم گھر پر ہی رہتے۔"

نجمہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

دراصل شرماتی ہوں اپنے آپ سے ۔ مجھے محبت کرنے سے ڈر آتا ہے۔"

"محبت تو آدمی کو بے خوف بنا دیتی ہے نجمہ۔"

نجمہ نے آہ بھری۔

"کاش ایسا ہو سکتا ۔ اچھا اب چلنا چاہیے ۔ مجھے نیند آ رہی ہے۔"

نجمہ نے گھڑی دیکھ کر کہا ۔ میر صاحب خاموش ہو گئے ۔ نجمہ انہیں ساتھ لیکر پچھلے دروازے باہر نکل آئی ۔ دروازے پر پرویز نے میر صاحب اور نجمہ کو الوداع کہی ۔ نجمہ گاڑی میں میر صاحب کو بٹھلا کر وہاں سے روانہ ہو گئی ۔ راستے میں اس نے پوچھا۔

"میں آپ کو کہاں چھوڑوں ؟"

میر صاحب نے کہا۔

"جی تو نہیں چاہتا کہ تمہیں چھوڑ دوں۔"

نجمہ مسکرائی۔

"کیا کیا جائے ؟ مجبوری ہے۔"

میر صاحب نے اپنی کوٹھی کا علاقہ بتایا ۔ اس علاقے میں ادھر آکر انہوں نے نجمہ سے گاڑی روکنے کو کہا اور گاڑی سے باہر نکل آئے ۔ نجمہ نے ہاتھ ہلا کر الوداع کہی اور اس سے بیشتر کہ میر صاحب سنبھلیں' وہ جان بوجھ کر گاڑی لے کر تیزی سے آگے بڑھ گئی۔

دراصل وہ میر صاحب کے اندر عشق اور ہوس کی آگ کو تیز کرنا چاہتی تھی اور اس مقصد میں وہ کامیاب ہو گئی تھی ۔ میر صاحب نجمہ کے عشق میں بری طرح پھنس گئے تھے اور نجمہ کی بے اعتنائی نے جلتی پر تیل کا کام کیا تھا ۔ نجمہ گاڑی لے کر چلی گئی اور میر صاحب وہاں اکیلے کھڑے کے کھڑے رہ گئے ۔ رات کافی بھیگ چکی تھی ۔ ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی اور آسمان پر

برسات کے ان گنت ستارے جھلملا رہے تھے ۔ ان کی کوٹھی ذرا آگے تھی ۔ میر صاحب قدم قدم چلتے اپنی کوٹھی کی طرف چل پڑے ۔ انہیں اس بات کا خیال تھا کہ کہیں ان کی بیگم کو ان کی شراب نوشی کا علم نہ ہو جائے ۔ اتنی مدت بعد انہوں نے شراب پی تھی اور ایک جوان جسم کو بوسہ دیا تھا ۔ میر صاحب اپنے آپ کو بالکل جوان محسوس کرنے لگے۔

لیکن جوں جوں گھر قریب آ رہا تھا ۔ وہ پھر پرانے ادھیڑ عمر کے میر صاحب بن رہے تھے جس کی بیگم ان کا انتظار کر رہی ہوگی اور جوان بیٹا اپنے کمرے میں سو رہا ہوگا ۔ اس قسم کی ذہنی بیداری نے ان کا نشہ آدھا کر دیا ۔ انہوں نے جیب سے ایک خوشبو دار گولی نکال کر منہ میں ڈالی اور کوٹھی کے احاطے میں داخل ہوگئے ۔ برآمدے میں جا کر انہوں نے دروازہ کھولا اور کمرے میں آکر کپڑے اتارنے لگے ۔ اتنے میں بیگم بھی وہاں آگئیں ۔ انہوں نے کہا۔

"آپ نے بڑی دیر کر دی ؟"

"ہاں کچھ دیر ہو ہی گئی ۔ وہاں کچھ پرانے دوست مل گئے ۔ بس گپ شپ ہوتی رہی۔"

اس کے بعد انہوں نے خواب گاہ میں جا کر پانی کا ایک گلاس پیا اور بستر پر لیٹ گئے ۔ بیگم بھی پاس والے پلنگ پر جا کر لیٹ گئی ۔ تھوڑی دیر بعد جب بیگم نے میر صاحب کے خراٹوں کی آواز سنی تو پلنگ پر سے اٹھ کر آہستہ سے اپنے خاوند کے پاس آئی ۔ جھک کر اپنا منہ میر صاحب کے منہ کے قریب کیا ۔ اس نے شراب کی بو محسوس کی ۔ بیگم کے چہرے پر تردد اور پریشانی کی لکیری نمودار ہوگئی ۔ وہ چپ چاپ اپنے پلنگ پر واپس آکر لیٹ گئی مگر کافی دیر تک اسے نیند نہ آئی۔

دوسرے روز بنک پہنچ کر میر صاحب نے پہلا کام یہ کیا کہ نجمہ کو کلب میں فون کیا ۔ نجمہ وہاں موجود تھی ۔ میر صاحب نے ادھر ادھر کی باتوں کے بعد رات کو پھر ملنے کی خواہش کا اظہار کیا تو نجمہ نے بہانہ بناتے ہوئے کہا۔

"بہت افسوس ہے میر صاحب! آج رات میرے ہاں کچھ مہمان آرہے ہیں۔"

میر صاحب خاموش ہوگئے۔

نجمہ نے جلدی سے کہا۔

"پھر کسی روز سہی۔"

میر صاحب نے کہا۔

"پھر کب؟"

"اگلے مہینے میں کسی روز۔"

میر صاحب چونک پڑے۔

" اگلے مہینے ۔۔۔ نہیں نہیں مس نجمہ ! یہ تو بہت دور کی بات جا پڑے گی ۔ کیا اس دوران میں ملاقات نہ ہو سکے گی؟"

نجمہ نے کہا:

" افسوس ہے میر صاحب ! جی تو چاہتا ہے کہ سارا دن آپ کے ساتھ بسر ہو مگر کیا کروں ۔ بعض مجبوریاں ایسی ہوتی ہیں کہ عورت کو اپنی خواہش قربان کرنی پڑتی ہے ۔ اچھا خدا حافظ ۔ میں فون کروں گی آپ کو ۔ فکر نہ کریں ۔ میں خود آپ کے بغیر بے چین ہوں ۔ خدا حافظ ! "

نجمہ نے فون جلدی سے بند کر دیا ۔ نجمہ کے آخری جملے نے میر صاحب کو پاگل سا بنا دیا ۔ ان کی آتش عشق مزید بھڑک اٹھی ۔ تو کیا خود نجمہ مجھ سے ملنے کو بے چین ہے ؟ کیا ایسا بھی ہو سکتا ہے ؟ میر صاحب سوچ سوچ کر فخر سے گردن بلند کرتے رہے اور دل ہی دل میں فخر کرتے رہے۔ لیکن ایک مہینہ نجمہ کے بغیر کیسے بسر ہو گا ۔ نہیں نہیں اسے ضرور ملنا ہو گا ، ہر حالت میں ملنا ہو گا۔ لیکن اسے مجبوری کیا ہے ۔ یہ تو میں نے پوچھا ہی نہیں ۔ میر صاحب نے اس خیال کے ساتھ ہی فوراً ہی نجمہ کو پھر فون کیا ۔ نجمہ وہاں موجود تھی مگر پرویز نے فون اٹھانے سے منع کر دیا ۔ خود رسیور اٹھایا اور میر صاحب کو بڑے شیریں لہجہ میں کہا کہ نجمہ صاحبہ تو جا چکی ہیں۔

" ابھی ابھی تو یہاں موجود تھیں ؟ "

" جی ہاں ! وہ ابھی یہاں سے گئی ہیں۔ "

" کچھ خبر ہے کب تشریف لائیں گی ؟

" کہہ نہیں سکتا ۔ آپ کون صاحب ہیں ؟

" کوئی نہیں ۔ شکریہ ! "

فون بند ہو گیا تو نجمہ اور پرویز کھل کھلا کر ہنس پڑے ، اس خیال کے ساتھ کہ میر صاحب کو اپنی شرافت اور وضع داری کا کس قدر خیال ہے کہ اپنا نام بتانا گوارا نہیں کیا۔

" لیکن نجمہ ! یہ مرغی ہاتھ سے جانے نہ پائے۔ "

" پرویز ! گھبراؤ نہیں ۔ میں کچی گولیاں نہیں کھیلی ہوئی ۔ "

" مجھے تم سے یہی امید ہے نجمہ۔ "

میر صاحب کو جب فون پر نجمہ سے بات کرنے میں ناامیدی ہوئی تو وہ پریشان ہو گئے ۔ دن میں دو ایک بار پھر انہوں نے فون کرنے کی کوشش کی مگر انہیں کامیابی نہ ہو سکی۔

شام کو انہوں نے گاڑی پکڑی اور فوراً نجمہ کی کوٹھی پر آ گئے ۔ نجمہ غسل خانے میں نہا رہی تھی ۔ وہ نشست گاہ میں بیٹھ کر رسالے وغیرہ دیکھنے لگے ۔ کوئی آدھ گھنٹے بعد نجمہ گیلے بالوں کو

سنوارتی سفید ریشمی **قمیض** اور سفید شلوار میں ملبوس اندر آئی ۔ باریک **قمیض** میں سے اس کا کندنی جسم عریاں دکھائی دے رہا تھا ۔ میر صاحب کا حلق خشک ہو گیا ۔

" معاف کیجئے گا مجھے دیر ہو گئی ۔ آپ نے کل پھر فون کیا تھا؟ "

" میں نے کوئی چھ سات مرتبہ تم سے ملنے کی کوشش کی مگر کامیاب نہ ہو سکا ۔ تم کہاں تھیں؟ "

نجمہ مسکرانے لگی اور بالوں کا یونہی سر پر جوڑا بنا کر میر صاحب کے سامنے صوفے پر بیٹھ گئی ۔ میر صاحب کو اس کے خوبصورت توانا جسم میں سے خوشبودار صابن کی مہک اٹھتی محسوس ہو رہی تھی ۔ نجمہ کا خوبصورت چہرہ تولئے کی رگڑ کی وجہ سے سرخ گلاب کے پھول کی طرح کھل رہا تھا ۔ نجمہ نے یوں معذرت کرتے ہوئے کہا کہ اسے کل ایک ضروری کام کی وجہ سے گھر سے باہر جانا پڑ گیا ۔ میر صاحب نے سگریٹ راکھدان میں دبا کر کہا۔

آخر ایسی کون سی مجبوری ہے نجمہ جس نے تمہیں پریشان کر رکھا ہے ؟ "

نجمہ نے محسوس کیا کہ شکار پنجرے کے قریب آ رہا ہے ۔ وہ چوکس ہو کر بیٹھ گئی ۔ اس نے نیم باز آنکھوں سے میر صاحب کی طرف دیکھا اور دونوں بازوؤں کو اوپر اٹھا کر اس طرح بالوں میں پھیرنے لگی کہ اس کے سینے کا ابھار زیادہ نمایاں ہو گیا ۔ میر صاحب کچھ بوکھلا سے گئے ۔ نجمہ نے بے نیازی سے کہا:

" میں آپ کو اپنی مجبوریاں نہیں بتانا چاہتی ۔ آخر آپ میرے ساتھ کیوں پریشان ہوں۔ "

میر صاحب بولے :

" ایسی بات نہیں نجمہ ! اگر میں تمہاری پریشانی دور کرنے کا باعث ہو سکوں تو مجھے اس کی خوشی ہو گی ۔ تم کوئی بات تو کرو ۔ کیا تمہیں کوئی روپے پیسے کی تکلیف ہے ؟ بتاؤ ؟ "

نجمہ نے پنجرے کا منہ کھول دیا ۔ اٹھ کر دونوں ہاتھ پشت پر رکھ کر ٹہلنے لگی ۔ پھر کھڑکی کے پاس جا کر کھڑی ہو گئی ۔ میر صاحب بھی اٹھ کر اس کے پاس چلے آئے ۔ انہوں نے آہستہ سے نجمہ کے کندھوں پر اپنے ہاتھ رکھ دیئے اور دھیمے سے کہا:

" کیا تم نے مجھے اس قابل بھی نہیں سمجھتیں نجمہ؟ "

نجمہ نے چہرہ پر بناوٹی اداسی طاری کر کے کہا:

" میں آپ کو تکلیف نہیں دینا چاہتی۔ "

" مجھے اس سے خوشی ہو گی نجمہ ! کاش میں تمہارے کام آ سکوں۔ "

نجمہ نے ایک نقلی آہ بھری اور چپکے سے میر صاحب کا ہاتھ پکڑ کر دبایا ۔ میر صاحب کو گویا دو جہان کی خوشیاں مل گئیں ۔ ان کے جسم میں جوانی کا پر جوش خون عود کر آیا ۔ انہوں نے نجمہ کا

ہاتھ چوم لیا۔

"تمہیں کتنی رقم چاہیے؟ بولو! بولو نجمہ!"

نجمہ نے بڑے پر معنی انداز میں میر صاحب کو دیکھا اور بولی۔

"میں نے دس ہزار میں اپنا سارا زیور رہن رکھا ہوا ہے۔ پرسوں میری ایک دوست کی شادی ہے۔ اگر میں زیور کے بغیر وہاں گئی تو میری سہیلی کیا کہے گی۔"

اور اس کے ساتھ ہی نجمہ کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ میر صاحب نے رومال نکال کر اس کے آنسو پونچھے اور اتنا کہہ کر باہر نکل گئے۔

"کل دوپہر کو تم گھر پر رہنا۔"

میر صاحب نے پھر کوئی بات نہ کی۔ باہر آکر گاڑی میں بیٹھے اور واپس چلے گئے۔ نجمہ اپنے شکار کو پنجرے میں بند دیکھ کر بے حد خوش ہوئی۔ اسے یقین تھا کہ شکار پھنس گیا ہے اور میر صاحب دوسرے روز روپے لیکر پہنچ جائیں گے۔ اس نے اسی وقت دوسرے کپڑے پہنے۔ سنگار وغیرہ کیا اور کلب کی طرف روانہ ہو گئی۔ وہ پرویز کو یہ خوش خبری سنانا چاہتی تھی۔ کلب میں آکر اسے معلوم ہوا کہ پرویز ابھی تک نہیں آیا۔

وہ پرویز کے کمرے میں آکر بیٹھ گئی اور کافی منگا کر پینے لگی۔ ابھی اس نے ایک پیالی ہی پی تھی کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ اس کے ساتھ ہی اسلم اندر داخل ہوا۔ اسلم میر صاحب کا لڑکا تھا اور نجمہ سے محبت کرتا تھا۔ نجمہ کو اس محبت کا بخوبی علم تھا مگر اس نے اسلم کو لفٹ دینا بند کر دی تھی کیونکہ اس نے اس کے باپ کو پھانس رکھا تھا۔ اسلم نجمہ کے پاس آکر بیٹھ گیا اور اس نے جیب سے سونے کی بڑی خوبصورت انگوٹھی نکال کر نجمہ کی انگلی میں ڈالتے ہوئے کہا۔

"میری محبت کا ایک حقیر تحفہ۔"

نجمہ مسکرا دی اور انگوٹھی والی انگلی ہوا میں لہرا کر بولی۔

"میں اس تحفے کی ہمیشہ قدر کروں گی۔ اسلم! تم بڑے اچھے ہو لیکن شاید تم میرا ساتھ نہ نبھا سکو۔ کیونکہ تم نوجوان ہو۔ زندگی کا سارا راستہ ابھی تمہارے سامنے کھلا پڑا ہے۔ تمہیں ابھی کئی مقامات پر اسی طرح دوسری لڑکیوں کو محبت کے تحفے دینے ہیں۔"

اسلم نے چہرے پر شکن لا کر نجمہ کے بالوں پر ہاتھ پھیر کر کہا۔

"میں ان لوگوں میں سے نہیں ہوں۔ تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے۔ تم زندگی کے ہر مرحلے ہر مقام پر مجھے اپنے ہمراہ دیکھو گی۔ خدا حافظ۔"

اتنا کہہ کر اسلم کمرے سے باہر نکل گیا۔ نجمہ نے سونے کی انگوٹھی کو تحسین آمیز نگاہوں سے دیکھا اور اس کا سر غرورسے بلند ہو گیا۔ تھوڑی دیر بعد وہاں پرویز بھی آگیا۔ نجمہ نے میر صاحب کا

سارا واقعہ اسے کہہ سنایا۔ پرویز بے حد خوش ہوا اور بولا۔

تمہیں محبت اور حسن کی پہلی قسط مبارک ہو۔"

"تمہیں بھی مبارک ہو۔ اگر تم میرے ساتھ نہ ہوتے تو میں اکیلی یہ کام نہیں کر سکتی تھی۔"

"اس میں سے تم پانچ ہزار چاہے تین ہزار مجھے دے دینا۔ میں اس سے اپنا کام چلانے کی کوشش کروں گا۔"

"تم چاہو تو ساری رقم لے سکتے ہو پرویز!"

"نہیں نجمہ! میں کسی کی محنت پر ڈاکہ نہیں ڈالنا چاہتا۔"

اس کے بعد انہوں نے تھوڑی تھوڑی سکاچ پی، کھانا کھایا، کلب کے فلور پر ڈانس کیا۔ رات گہری ہو گئی۔ انہوں نے پھر سکاچ پی اور کلب کی گیلری میں آکر صوفوں پر نیم دراز ہو گئے۔ نجمہ کو نشہ ہوگیا تھا اور وہ منہ بگاڑ کر لفظ ادا کر رہی تھی۔ پرویز بھی نشے میں تھا مگر ہوش مندی کے عالم میں تھا۔ نجمہ کچھ زیادہ ہی پی گئی تھی۔

وہ بار بار اپنی قمیض کو نوچ رہی تھی۔ پھر اس نے اپنا جوڑا کھول دیا۔ اس کے سیاہ خوشبودار بال اس کے شانوں پر بکھر گئے۔ پرویز نے اسے سنبھالنے کی کوشش کی مگر نجمہ نے اسے جھٹک دیا اور خود بلند آواز میں گانے لگی۔ پرویز نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھا۔ لیکن نجمہ نے دونوں ہاتھوں سے پرویز کو دھکیل دیا۔ پرویز نے جلدی سے نجمہ کے ہونٹوں پر اپنے ہونٹ پیوست کر دیئے۔ اور اسے بھینچ لیا۔ نجمہ گویا اس لمحے کی منتظر تھی۔ وہ بھی پرویز سے بری طرح لپٹ گئی اور اسے صوفے پر گرالیا۔ صوفے پر سے لڑھک کر دونوں نیچے قالین پر آگرے لیکن ان کے ہونٹ ایک دوسرے سے بالکل جدا نہ ہوئے۔

دوپہر کو نجمہ بے تابی سے اپنے شکار یعنی میر صاحب کا انتظار کرنے لگی۔ پرویز کوٹھی پر نہیں تھا۔ نجمہ گھر میں بالکل اکیلی تھی مگر پرویز نے اسے تاکید کر رکھی تھی کہ اسے اپنی کامیابی کی ڈرائیور بھیج کر فوراً اطلاع کر دے۔ نجمہ نے بڑی بیش قیمت ساڑھی پہن رکھی تھی اور بالوں میں رات کے گیلے رومال میں بھگو کر رکھے ہوئے موتیئے کے دو ہار گوندھ رکھے تھے۔ اس نے پلکیں بنائی ہوئی تھیں اور بلا کا سنگار کر رکھا تھا۔ ذرا باہر کسی کار کی آواز آتی تو وہ لپک کر کھڑکی کی طرف جاتی اور تھوڑا سا پردہ اٹھا کر باہر دیکھنے لگتی۔ پورے ایک بجے باہر گاڑی کے ہارن کی آواز سنائی دی۔ نجمہ بھاگ کر کھڑکی کے پاس گئی۔ اس نے چوری چوری پردہ تھوڑا سا ہٹا کر باہر دیکھا۔ میر صاحب گاڑی میں سے باہر نکل کر ڈرائیور کو گاڑی کھڑی کرنے کا کہہ رہے تھے۔ نجمہ جلدی سے دوسرے کمرے میں چلی گئی اور خادمہ سے کہہ دیا کہ میر صاحب کو تھوڑا سا انتظار

کروائے۔

میر صاحب نے گھنٹی بجائی ۔ خادمہ نے دروازہ کھولا اور میر صاحب کو ڈرائینگ روم میں بٹھلا کر کہا:

"تشریف رکھیئے ۔ بیگم صاحبہ ابھی آتی ہیں۔"

نجمہ دوسرے کمرے میں پلنگ پر یونہی بیٹھی رہی اور اپنی کلائی والی گھڑی کو دیکھتی رہی ۔ پورے دس منٹ گزر گئے تو اس نے اٹھ کر آئینے کے سامنے جا کر اپنے سنگار کو ایک نظر دیکھا۔ رخساروں پر ہلکا سا پوڈر لگایا ۔ بازوؤں پر عطر ملا اور چہرے پر پیشہ ورانہ مسکراہٹ لے کر ڈرائینگ روم میں آگئی۔

"معاف کیجئے گا مجھے ذرا دیر ہوگئی ۔ آپ کو زحمت تو نہیں ہوئی ؟"

میر صاحب نے نجمہ کا توبہ شکن سنگار دیکھا تو حیران رہ گئے ۔ کھڑے ہو کر نجمہ کی تعظیم کی اور مسکرا کر بولے:

"میں تو قیامت تک انتظار کر سکتا ہوں۔"

نجمہ شوخی سے ہنسی اور میر صاحب کو اپنے ہاتھ سے شربت بنا کر دیا ۔ میر صاحب نے شربت کا ایک گھونٹ پیا اور جیب سے دس ہزار روپے کے نوٹوں کا پلندہ نکال کر میز پر نجمہ کے سامنے رکھ دیا ۔

نجمہ نے حیرت سے کہا:

"یہ آپ نے کیا تکلیف کی ---- آخر آپ میری وجہ سے پریشان کیوں ہوئے؟"

میر صاحب سگریٹ کی راکھ جھاڑ کر بولے:

"یہ میری خوش نصیبی ہے نجمہ کہ میں تمہارے کسی کام آیا ہوں ۔ پورے دس ہزار ہیں ۔ اب تم اپنا زیور چھڑوا لینا اور انہیں پہن کر اپنی سہیلی کے ہاں جانا۔ میں تمہیں کسی حالت میں بھی مصیبت میں مبتلا نہیں دیکھ سکتا۔"

نجمہ نے نوٹوں کو بالکل ہاتھ نہ لگایا بلکہ رومال آنکھوں پر رکھ لیا اور یونہی دو ایک آنسو بہا دیئے ۔ میر صاحب بے چین ہوگئے ۔ انہوں نے اٹھ کر نجمہ کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور کہنے لگے:

"اس میں رونے کی کیا بات ہے ۔ تمہیں تو خوش ہونا چاہیے نجمہ کہ میں تمہارے کام آیا ہوں ۔ یہ تو معمولی رقم ہے ۔ تم اگر کہو تو میں تمہاری خاطر جان قربان کر سکتا ہوں۔"

نجمہ نے میر صاحب کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیکر دبایا اور اسے بے اختیار چوم لیا۔

"آپ کتنے اچھے ہیں۔"

میر صاحب خوشی سے دیوانے سے ہوگئے ۔ یہ پہلا موقع تھا کہ نجمہ نے محبت سے میر صاحب کے ہاتھوں کو بوسہ دیا۔ انہوں نے نجمہ کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر صوفے پر سے آہستہ سے اٹھا کر اپنے ساتھ لگا لیا ۔ نجمہ کو میر صاحب کے کپڑوں سے ان کے پسینے کی بو آئی۔ اس بو میں حنا کے عطر کی خوشبو ملی ہوئی تھی ۔ میر صاحب نے اپنی بانہیں نجمہ کی کمر کے گرد حمائل کر دیں ۔ نجمہ اب سوائے اس کے اور کچھ نہ کر سکتی تھی کہ وہ میر صاحب کو آغوش میں لیکر محبت کا جواب محبت میں دے ۔ چنانچہ اس نے اپنی بانہیں میر صاحب کی گردن میں ڈال دیں اور ان کے ہونٹوں پر اپنے ہونٹ رکھ دیئے ۔ میر صاحب کتنی ہی دیر ایک کیف دوام کے عالم میں کھڑے نجمہ کے ہونٹوں سے محبت کا نور حاصل کرتے رہے ۔ انہیں یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے انہوں نے خوشبوؤں ، پھولوں اور روشنیوں کا سیلاب اپنے ہاتھوں میں تھام رکھا ہے ۔

پھر نجمہ آہستہ سے الگ ہوگئی ۔ میر صاحب بے خودی کے عالم میں صوفے پر بیٹھ گئے اور کتنی ہی دیر بت بنے وہاں بیٹھے رہے ۔ انہیں یقین نہیں آرہا تھا کہ ابھی ابھی انہوں نے ایک انتہائی خوبصورت ، نوجوان ، صحت مند اور بھرپور پرشباب عورت کو اپنے ساتھ لپٹا رکھا تھا ۔ تھوڑی دیر بعد وہ اٹھ کر چلنے لگے تو نجمہ نے کہا:

"کھانا یہیں کھا لیجئے گا۔"

"نہیں گھر پر میرا انتظار ہو رہا ہو گا۔ خدا حافظ۔"

نجمہ انہیں باہر تک چھوڑنے آئی ۔ میر صاحب گاڑی میں سوار ہو کر چلے گئے ۔ نجمہ برآمدے میں سر جھکائے قدم قدم چلتی ڈرائینگ روم میں آئی اور دروازہ بند کر کے تیزی سے میز کی طرف گئی جس پر دس ہزار کے نوٹوں کا پلندہ پڑا تھا ۔ اس نے سارے نوٹوں کو دو تین بار گنا ۔ پورا دس ہزار روپیہ تھا ۔ خوشی سے اس کے رخسار تمتما رہے تھے اور آنکھوں میں عجیب قسم کی وحشیانہ چمک آگئی تھی ۔ جس طرح کئی دن کے بھوکے کتے کی آنکھوں میں ہڈیوں کو دیکھ کر آجاتی ہے۔

نجمہ نے سارے نوٹوں کو الماری میں بند کر کے تالا لگایا ۔ چابی اپنے پرس میں رکھی اور خود اپنی گاڑی میں بیٹھ کر پرویز کو یہ خوش خبری سنانے کلب کی طرف چل پڑی ۔ پرویز اپنے کمرے میں بیٹھا کھانا کھانے کی تیاریاں کر رہا تھا ۔ نجمہ تیزی سے اندر داخل ہوئی اور مسکرا کر بولی:

"میدان مار لیا؟"

"سچ ؟"

"بالکل سچ ۔ دس ہزار روپیہ اس وقت میری الماری میں ......"

اس سے بیشتر کہ جملہ پورا ہو پرویز نے اٹھ کر نجمہ کا منہ چوم لیا اور اپنے ہاتھ سے سکاچ

کا ایک جام بنا کر اسے دیا۔ دونوں نے اپنی کامیابی کا جام تجویز کیا اور ایک ہی گھونٹ میں اسے حلق میں اتار لیا۔

میر صاحب کے پاس اتنی بڑی رقم کبھی بھی نہ جمع ہو سکتی تھی۔ بنک سے انہیں جو تنخواہ ملتی تھی وہ گھر کے بڑھے ہوئے ضروری اخراجات پر خرچ ہو جاتی تھی۔ وہ اتنا بڑا قرض بھی کسی سے نہیں مانگ سکتے تھے۔ ادھر نجمہ کے عشق میں وہ اس بری طرح گرفتار ہو چکے تھے کہ اس کی تکلیف اور پریشانی بھی ان سے نہ دیکھی جاتی تھی۔ پھر وہ کیا کریں اور کہاں سے دس ہزار روپیہ حاصل کریں۔ اگر انہوں نے نجمہ کو دس ہزار روپیہ نہ دیا تو ان کی بڑی بے عزتی ہو گی۔ وہ نجمہ سے وعدہ کر کے آئے ہیں۔ دوسرے سمجھتے ہیں کہ میر صاحب بنک کے مینیجر ہیں کوٹھی کار والے ہیں ان کے پاس تو دس ہزار روپے گھر میں ضرور ہونے چاہئیں لیکن گھر پر سوائے چند روپوں کے اور کچھ نہیں تھا۔ پھر کیا ہو۔ پرسوں نجمہ کو روپے چاہئیں۔ نجمہ کا اداس چہرہ بار بار ان کی آنکھوں کے سامنے آجاتا۔ انہوں نے دفتر کے سیف میں چابی لگا کر اسے کھولا۔ سیف کے ایک خانے میں بیس ہزار روپے کی رقم اور کچھ زیورات وغیرہ پڑے تھے۔ میر صاحب نے سوچا کہ فی الحال ان میں سے مطلوبہ رقم نجمہ کو ادا کر دی جائے بعد میں وہ سوچ لیں گے کہ بنک والی رقم کہاں سے پوری ہو۔ چنانچہ انہوں نے کافی سوچ بچار اور ذہنی پریشانی کے بعد سیف میں سے دس ہزار کی رقم نکال کر بیگ میں رکھ لی اور نجمہ کو جا کر دے دی۔ واپس آکر وہ اس تذبذب میں پھنس گئے کہ بنک کا گھاٹا کہاں سے پورا ہو گا۔ وہ رقم ایسی تھی کہ کوئی ایک ماہ تک اس کے بارے میں کسی کو علم نہیں ہو سکتا تھا۔ انہوں نے سوچا ایک ماہ تو آرام سے بسر کر لیا جائے' اس کے بعد دیکھا جائے گا۔ کہیں نہ کہیں سے روپوں کا انتظام ہو جائے گا۔

اس کے باوجود میر صاحب چونکہ دفتر کے معاملے میں بڑے ایماندار واقع ہوئے تھے اور کبھی انہوں نے بنک کے حساب میں سے ایک پائی بھی ادھر سے ادھر نہیں کی تھی۔ وہ بے چین سے رہنے لگے۔ سارا سارا وقت یہ سوچ کر گزار دیتے کہ روپے کی کمی کہاں سے اور کیونکہ پوری کی جائے؟ اس دوران میں نجمہ کو مزید دس ہزار کی ضرورت پڑ گئی۔ اس نے ایسا چکر چلایا کہ بستر پر پڑ گئی کہنے لگی جب تک اس کا مطالبہ پورا نہیں ہو گا' وہ اچھی نہیں ہو گی۔ دوسری طرف ایک وجہ یہ بھی ہو گئی کہ نجمہ نے میر صاحب کو ان کی کوشش کے باوجود انہیں ایک خاص حد سے بالکل آگے نہ بڑھنے دیا بلکہ انہیں روک دیا اور مزید روپوں کی فرمائش کر دی۔ اس بات نے میر صاحب کی آتش ہوس کو تیز کر دیا۔ چونکہ وہ پہلے دس ہزار روپے کا غبن کر چکے تھے چنانچہ انہیں مزید دس ہزار روپے نکالتے ہوئے کوئی زیادہ محسوس نہ ہوا۔ انہوں نے فوراً دوسری مرتبہ بھی دس ہزار روپے بنک میں سے نکال کر نجمہ کے حوالے کر دیئے۔ اب نجمہ نے باقاعدہ میر صاحب کی دلجوئی کرنا شروع کر دی۔ روزانہ

شام کو ان کے ساتھ کوٹھی یا کلب میں کھانا کھاتی، ان سے دبے دبے محبت بھرے جملے کہتی، ان کی طرف ترچھی نظروں سے یوں دیکھتی گویا ان کی محبت میں جل رہی ہے۔ پرویز کے بھی پاؤ بارہ تھے۔ وہ بھی میر صاحب کی بڑی خاطر مدارت میں لگا رہتا۔ میر صاحب کو نجمہ نے یقین دلا دیا تھا کہ وہ ان سے بے حد محبت کرتی ہے اور اب ساری زندگی ان ہی کے ساتھ بسر کرے گی۔

"آپ نے تو بے راہ زندگی کو منزل کا نشان دکھایا ہے۔ آپ سے پہلے میں راستے میں بھٹک رہی تھی لیکن اب میری زندگی کا مجھے سراغ مل گیا ہے۔"

نجمہ کے منہ سے پر محبت انداز میں ایسے عشقیہ جملے سن کر میر صاحب کی آنکھیں بند ہو جاتیں اور فخر سے ان کی گردن تن جاتی۔ بھلا اس عمر میں ان پر کبھی ایک خوبصورت' صحت مند اور جوان عورت عاشق ہو سکتی تھی اور پھر ایسی عورت جسے بہتر سے بہتر' جوان سے جوان اور خوبصورت سے خوبصورت عاشق مل سکتا ہو۔ میر صاحب پوری طرح سے نجمہ کے جال میں پھنس چکے تھے اور انہیں اس بات کا ہوش نہ رہا تھی کہ وہ ایک شریف کنبے کے سربراہ ہیں اور ایک جوان بیٹے کے باپ ہیں، شہر میں ان کی عزت ہے اور بنک والوں نے ان پر لاکھوں روپے کا بھروسہ کر رکھا ہے۔ میر صاحب بنک میں سے گاہے گاہے رقم نکال کر نجمہ کی فرمائش پوری کرتے رہتے تھے۔ بنک سے اس طرح غبن کرنے میں انہوں اپنے سیکرٹری کو بھی ساتھ ملا رکھا تھا۔ پہلے تو انہیں یہ خیال تھا بلکہ پورا یقین تھا کہ بنک میں سے نکالی ہوئی رقم کسی نہ کسی طرح کہیں نہ کہیں سے لے کر پوری کر دیں گے۔ انہوں نے اپنی گاڑی فروخت کرنے کے بارے میں بھی سوچ رکھا تھا مگر جوں جوں غبن کی رقم میں روز بروز اضافہ ہوتا گیا میر صاحب بھی بے دھڑک ہوتے گئے۔ دوسرے وہ اس چابکدستی سے حساب کتاب میں ہیر پھیر کر کے روپیہ اڑاتے کہ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوتی۔ ان کا سیکرٹری بڑا ہوشیار آدمی تھا اور بنک کے تمام ہیر پھیر سے واقف تھا۔ جب اس نے دیکھا کہ بنک کا مینیجر اسے اعتماد میں لے رہا ہے تو اس نے بڑی گرم جوشی سے تعاون کیا۔

بلکہ وہ تو یہاں تک کرنے لگا کہ ہر بار غبن کی رقم میں سے ہزار دو ہزار اپنے لئے نکال لیتا اور خوب عیش کرتا۔ لیکن میر صاحب نے بڑا پختہ کام کر رکھا تھا۔ انہوں نے سیکرٹری سے مل کر ایک ایسے آدمی کی کثیر رقم کو ایک جعلی آدمی کے نام منتقل کروا دیا تھا جو ایک عرصہ سے جنوبی افریقہ میں تھا اور جس نے کئی سالوں سے اپنی رقم میں سے ایک پائی بھی خرچ نہیں کی تھی۔ اس جعلی آدمی کے نام چیک بک ایشو کر دی گئی تھی اور اس کے جعلی دستخط میر صاحب خود کرتے اور سیکرٹری کی مدد سے بنک میں سے مطلوبہ رقم نکلوا لیتے۔ میر صاحب کے گھر والوں کو کسی

قسم کا شبہ بھی نہیں تھا کہ میر صاحب ان کے حق میں کیسے زہریلے اور خوفناک کانٹے بو رہے ہیں ۔ میر صاحب کی بیگم کو بھی کبھی وہم نہ ہوا تھا کہ ان کا خاوند ایک آوارہ عورت کے چکر میں پھنس چکا ہے اور بنک سے غبن کر کے اس عورت پر روپیہ پانی کی طرح بہا رہا ہے۔

میر صاحب کی پرانی عیاش شخصیت پوری طرح باہر آچکی تھی ۔ وہ بڑے ہوشیار اور چالاک تماش بین کی حیثیت سے سامنے آگئے تھے۔ وہ نجمہ کے ہاں سے زیادہ شراب پی کر اپنے گھر نہ آتے ۔ ہمیشہ رات کو اپنے گھر آکر سویا کرتے ۔ دن بھر نجمہ کی کوٹھی پر داد عیش دیا کرتے اور رات کو اپنی بیگم کے پاس آجایا کرتے ۔ نجمہ بڑی مکار عورت تھی ۔ وہ پوری طرح میر صاحب کے سامنے کھلنے کے باوجود اپنے آپ کو کافی حد تک چھپائے ہوئے تھی ۔ اس کے ترکش میں ابھی کئی تیر چھپے ہوئے تھے ۔ وہ ان تیروں کو ایک ایک کر کے آزما رہی تھی ۔ میر صاحب ہر قدم مزید جوش اور دیوانگی کے عالم میں نجمہ کی طرف بڑھاتے چلے جا رہے تھے ۔ ان کی محبت اور ہوس میں وقت کے ساتھ اضافہ ہوتا جا رہا تھا ۔ یہ ایک شراب تھی جس کو پی کی نشہ کم ہو رہا تھا اور تشنگی زیادہ بڑھ رہی تھی۔

سلمہ گھر میں میر صاحب کی بالکل بیٹیوں کی طرح دیکھ بھال کیا کرتی تھی ۔ وہ ان کی شیروانی ' کوٹ اور قمیض میں ٹوٹے ہوئے بٹن لگاتی ۔ انہیں شام کی چائے خود بنا کر دیتی ۔ اسی طرح وہ اپنی چچی کی بھی خدمت گزاری کیا کرتی، لیکن ان سب سے زیادہ اسلم کا خیال رکھا کرتی ۔ اسلم گھر پر نہ ہوتا تو اس کے کمرے میں جا کر بکھری ہوئی چیزوں کو خود قرینے سے لگاتی ، اس کی کتابوں کو درست کرتی ، پرانے کپڑے الماری میں سے نکال کر لانڈری میں پہنچاتی ۔ رومال اور جرابیں اپنے ہاتھ سے دھو کر انہیں استری کرتی ۔ رات کو اس کے سرہانے دودھ کا گلاس جا کر رکھتی ۔ اس لئے کہ سلمہ کو اسلم سے محبت تھی ۔ یہ محبت اس وجہ سے اور بھی شدت اختیار کر گئی تھی کہ گھر والوں کا خیال اسلم سے اس کی شادی کرنے کا تھا ۔ وہ دل ہی دل میں اسے اپنا خاوند تسلیم کر چکی تھی اور اس کی ہر طرح سے خدمت گزاری کو اپنا فرض سمجھتی تھی۔

لیکن اسلم نے کبھی سلمہ سے زیادہ بات نہیں کی تھی ۔ اگر کبھی آپس میں کوئی بات ہو بھی جاتی تو اسلم مختصر سا جواب دے کر یا تو پڑھنے میں مصروف ہو جاتا یا سو جاتا اور یا باہر نکل جایا کرتا ۔ سلمہ نے ان باتوں کا کبھی برا نہیں مانا تھا کیونکہ وہ اس بے نیازی کو اسلم کی عادت اور طبیعت پر محمول کرتی تھی ۔ وہ جانتی تھی کہ اسلم اپنے موڈ کا آدمی ہے ۔ اس کا جی چاہے تو بات کرتا ہے۔ نہ جی چاہے تو کسی سے نہیں بولتا ۔ وہ بے چاری اس بات سے بالکل بے خبر تھی کہ اسلم اس سے بالکل محبت نہیں کرتا بلکہ ایک ایسی آوارہ اور چالاک عورت سے عشق کر رہا ہے جو اس کے باپ کو بھی اپنے جال میں پھنسا چکی ہے ۔ ادھر اسلم کو بھی معلوم نہ تھا کہ اس کا باپ بھی نجمہ

سے عشق کر رہا ہے ۔ نجمہ پرویز کے ساتھ مل کر دونوں باپ بیٹوں کو الو بنا رہی تھی اور انہیں دونوں ہاتھوں سے لوٹ رہی تھی۔ حقیقت میں نجمہ کو اسلم سے کوئی دل چسپی نہیں تھی کیونکہ اسلم اپنے باپ کے زیر نگیں تھا ۔ ویسے بھی اگر آدمی کا کسی درخت کے پھل پر قبضہ ہو جائے تو وہ اس کے تنے کی پروا نہیں کرتا۔

نجمہ اسلم کو ہاتھ سے کھونا نہیں چاہتی تھی ۔ وہ سمجھتی تھی کہ یہ نوجوان ہے اس کا عشق پر جوش ہے ۔ اگر اسے ایک قدم چھوڑ دیا گیا تو کیا جانے ناامیدی کے عالم میں کیا کچھ کر ڈالے ۔ اس نے صرف اتنی احتیاط کر رکھی تھی کہ کسی طرح اسلم کو اس کے باپ اور اس کے باپ کو اسلم کے عشق کا علم نہ ہو۔

اسلم ایک روز تیسرے پہر کالج کی کسی تقریب میں جانے لگا تو اسے معلوم ہوا اس کی ایک بھی ٹائی ٹھیک نہیں ۔ سب کی سب استری ہونے والی ہیں اور چر مر ہو کر پڑی ہیں ۔ اس نے شور مچا کر سارا گھر سر پر اٹھا لیا ۔ سلمہ نے فوراً استری کا پلگ لگایا ۔ اسلم کی ایک ٹائی لی اور اسے جلدی جلدی استری کرنے لگی ۔ اسلم نے ٹائی کھینچ لی۔

"چھوڑو! اب اس کا کیا فائدہ ہے ۔ پانچ بج رہے ہیں ۔ اور ساڑھے چار بجے مجھے کالج پہنچ جانا چاہیئے تھا ۔ اب میں ٹائی لیکر کیا کروں گا۔"

سلمہ نے دوسری ٹائی پر استری پھیرتے ہوئے کہا:

"میں ابھی استری کر دیتی ہوں ۔ آپ ناراض تو نہ ہوں ۔"

اسلم نے گردن اٹھا کر کہا:

مجھے تم سے ناراض ہونے کی کیا ضرورت ہے ؟ میں اس گھر میں کسی کو اتنی اہمیت نہیں دیتا کہ اس سے ناراض ہوتا پھروں۔"

سلمہ کو اسلم کی یہ بات تیر بن کر دل میں چبھتی ہوئی محسوس ہوئی ۔ تو کیا وہ اسے اتنی اہمیت بھی نہیں دیتا کہ اس سے کبھی کبھی ناراض ہی ہو ؟ یہ کیا پتھر دل انسان ہے ۔ ایک عرصہ سے اس کے سامنے بیٹھی محبت کی بھیگ مانگ رہی ہوں اور یہ ہے کہ اس نے کبھی آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا۔ بہرحال اس نے جلدی جلدی استری کر کے ٹائی اسلم کو دی اور خود دوسرے کمرے میں چل گئی۔

رات کو اسلم دیر سے لوٹا اور اپنے کمرے کی بتی جلا کر کچھ لکھنے بیٹھ گیا ۔ اس وقت وہ اپنی کاپی پر عشقیہ شعر نقل کر رہا تھا جو وہ نجمہ سے باتیں کرتے ہوئے موقع محل کے مطابق بول دیا کرتا تھا ۔ سلمہ نے دیکھا کہ دودھ کا گلاس باورچی خانے میں ویسے کا ویسا ہی پڑا ہے ۔ اس نے گلاس پلیٹ میں رکھا اور اسلم کے کمرے میں داخل ہوگئی ۔ اسلم نے آنکھ اٹھا کر سلمہ کو دیکھا اور پھر کاپی

میں اشعار نقل کرنے میں مشغول ہوگیا۔ سلمہ سر پر دوپٹہ اوڑھے قدم قدم چلتے اسلم کے قریب تپائی تک آگئی اور آہستہ سے دودھ کا گلاس وہاں رکھ کر واپس مڑنے لگی تو اسلم نے کہا:

"ٹھہرو!"

سلمہ وہیں رک گئی۔ اسلم نے کاپی بند کر کے قلم میز پر رکھ دیا اور سگریٹ سلگا کر بولا:

"میرا ایک کام کرو گی سلمہ ؟"

اسلم کے منہ سے اپنا نام سن کر سلمہ کے انگ انگ میں خوشی کی لہریں دوڑ گئیں اور پھر اسلم نے اسے اپنا کام ختم کرتے کے لئے منتخب کیا تھا۔ کتنی اچھی بات تھی سلمہ نے واپس پلٹ کر پوچھا۔

"کہئے؟"

" اس کتاب میں سے میری کاپی میں نشان لگے شعر تو نقل کر دو۔"

"بہت اچھا۔"

"لیکن مجھے صبح چاہئیں۔"

" اچھا۔" "جی اچھا۔"

"ذرا خوش خط لکھنا۔ غلطی مت کرنا۔"

سلمہ نے کاپی اور شعروں کی کتاب اٹھائی اور چپکے سے اسلم کے کمرے سے باہر نکل کر اپنے کمرے میں آگئی۔ آج اس کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ ہی نہیں تھا۔ آج اسلم نے خود اسے ایک کام کہا تھا۔ وہ اتنی دیر سے اسلم کی خدمت کرتی چلی آرہی تھی مگر اسے اتنی خوشی کبھی نہ ہوئی تھی۔ جتنی اسے آج ہو رہی تھی۔ وہ تو ساری رات بیٹھ کر شعر نقل کرتی رہے گی۔ اس نے کتاب کی ورق گردانی کر کے نشان زدہ اشعار دیکھے۔ کوئی ڈیڑھ سو کے قریب اشعار تھے۔ سلمہ نے ٹیبل لیمپ جلالیا اور قلم نکال کر بڑی احتیاط اور خوش خطی سے کاپی پر شعر نقل کرنے لگی۔

سارے کے سارے شعر عشقیہ تھے اور محبت کے جذبات سے لبریز تھے۔ سلمہ ہر شعر پر اپنے اندر ایک نئی لہر سی ابھرتی محسوس کرتی جو اس کے سارے بدن میں سرایت کر جاتی۔ مثلاً کچھ اشعار یوں تھے۔

؎ چاہت روگ برا ہے جی کا میر اس سے پرہیز کرو
اگلے لوگ سنا ہے ہم نے جی نہ کسو سے لگاتے تھے
میر

؎ اے پر تو خورشید جہاں تاب ادھر بھی

سائے کی طرح ہم پہ عجب وقت پڑا ہے
غالب

؎ پھرتے ہو کیوں درختوں کے سائے میں دور دور
کر لو موافقت کسی بے برگ و بار سے
میر

؎ آتی ہے بوئے داغ شب تار ہجر میں
سینہ بھی چاک ہو نہ گیا ہو قبا کے ساتھ
مومن

؎ جلا ہے جسم وہاں دل بھی جل گیا ہوگا
کریدتے ہو جو اب راکھ جستجو کیا ہے
غالب

؎ دل کی بے تابیوں کے عالم کا
زندگی نام رکھ دیا کس نے
پر نکلتے ہی آشیانے میں
دانہ و دام رکھ دیا کس نے
میر

؎ کرتے کس منہ سے ہو غربت کی شکایت غالب
تم کو بے مہری یاران وطن یاد نہیں
غالب

؎ کمر باندھے ہوئے چلنے کو یاں سب یار بیٹھے ہیں
بہت آگے گئے باقی جو ہیں تیار بیٹھے ہیں
بسانے نقش پائے رہروان کوئے تمنا میں

انہیں اٹھنے کی طاقت کیا کریں لاچار بیٹھے ہیں
نہ چھیڑ اے نکہتِ بادِ بہاری راہ لگ اپنی
تجھے اٹکھیلیاں سوجھی ہیں ہم بیزار بیٹھے ہیں
بھلا گردش فلک کی چین لینے دیتی ہے کسے انشا
غنیمت ہے جو ہم صورت یہاں جو دو چار بیٹھے ہیں
انشا

اس کے بعد وہاں ایک طویل نظم تھی جو سلمہ کی سمجھ میں بالکل نہیں آئی۔ اس نظم میں کسی خانہ بدوش نے اپنی محبوبہ سے خطاب کر کے اپنے گھربار کا رونا رویا تھا جو اب تباہ ہو چکا تھا۔ سلمہ کو یہ بات بڑی عجیب لگی کہ ایک خانہ بدوش اپنے پرانے گھربار کا رونا روئے۔ کیونکہ اس نے تو یہی سنا اور پڑھا تھا کہ خانہ بدوشوں کا کوئی گھربار نہیں ہوتا۔ بہرحال اس بے چاری محبت کی ماری نے رات کے دو بجے تک بیٹھ کر اسلم کے سارے شعر اس کی کاپی میں نقل کر لئے۔ وہ رات بھر یہی سوچتی رہی کہ اسلم یہ شعر کس کے لئے نقل کروا رہا ہے اور یہ کہ وہ یہ اشعار کس کو اپنی محبت بھرے خطوط میں لکھتا ہے؟ اسلم نے اسے تو کبھی بھی کوئی محبت بھرا خط نہیں لکھا تھا بلکہ اس نے کبھی محبت کی کوئی بات نہیں کہی تھی۔ خط لکھنے کا تو سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا۔

پورے دو بجے رات سلمہ نے سارے شعر نقل کرنے کے بعد کاپی بند کر کے اپنی الماری میں رکھی اور بستر پر لیٹ گئی۔ اس نے ٹیبل لیمپ بجھا دیا اور چپ چاپ بستر میں لیٹی اسلم کے بارے میں سوچتی رہی ------ جانے رات کیا بجا تھا کہ اسے نیند آگئی اور وہ سو گئی

صبح اٹھ کر اس نے ناشتے پر کاپی اسلم کو دی۔ اسلم نے کاپی کھول کر دیکھی اور سارے اشعار پر نظر دوڑائی۔ مسکرا کر بولا:

"تم نے سارے کے سارے شعر نقل کر دیئے۔ بھئی! تم نے تو کمال کر دیا۔"

سلمہ اتنی سی بات سے ہی بڑی خوشی ہو گئی تھی کہ اسلم اس سے مسکرا کر بات کر رہا تھا۔ اس سر دوپٹے سے ڈھانپ کر کہا:

"اگر اس سے دوگنے اشعار بھی ہوتے تو میں ساری رات بیٹھ کر انہیں کاپی پر اتار دیتی۔"

"بھئی! اس کا مطلب یہ ہے کہ تم بڑی کام کی لڑکی ہو۔"

سلمہ نے سوچا کاش اسلم اسے یہ کہتا کہ وہ بڑی پیاری لڑکی ہے۔ بڑی محبت کئے جانے والی لڑکی ہے لیکن اسلم تو اس طرح کی بات کبھی کرتا ہی نہیں تھا۔ اس نے تو ایسی بات کبھی کی ہی نہیں تھی جس سے اظہار محبت کا کوئی بھی پہلو نکلتا ہو۔ وہ تو شاید سلمہ کو ایک گھریلو مشین سمجھتا تھا جس کا کام سوائے گھر والوں کے کرتے پاجامے سینے کے اور کچھ نہیں تھا۔ ایک طرح سے

سلمہ کو اس میں اپنی توہین بھی محسوس ہوئی مگر بیچاری کم زبان لڑکی اندر ہی اندر اپنی بے عزتی کو سہہ گئی اور زبان سے کچھ نہ بولی۔

اس نے صرف اتنا کہا:

"اگر کوئی اور کام ہو تو مجھے دے دیجئے، میں کردوں گی۔"

اسلم نے ہنس کر کہا:

"بھئی! تمہارا بہت بہت شکریہ! ابھی تو یہی کام بڑا اہم تھا۔ اگر کوئی اور کام نکلا تو ضرور یاد کروں گا۔"

سلمہ دل مسوس کر رہ گئی تو اس کا مطلب یہ ہے کہ سوائے کسی غرض، مطب اور کام کے اسلم اسے کبھی یاد نہیں کرے گا۔ مگر وہ تو اس پر اپنا دل مٹائے بیٹھی تھی وہ تو اسے اپنا خاوند' مجازی خدا سمجھے بیٹھی تھی۔ یہ کیسا تضاد تھا۔ یہ کیسی درمیان میں خلیج حائل ہوگئی تھی؟ وہ اس کو اپنی زندگی کے اتنا قریب سمجھ رہی ہے اور وہ اس کی زندگی سے اتنا بے تعلق اور اتنا دور ہے۔ سلمہ چپ چاپ اپنے کمرے میں آگئی اور پلنگ پر گر کر دونوں ہاتھوں میں اپنا چہرہ چھپا کر رونے لگی۔ کتنی ہی دیر وہ اکیلی اس کمرے میں دل کا غبار نکالتی رہی اور روتی رہی۔ پھر اس نے اٹھ کر منہ دھویا، رخساروں پر تھوڑا سا پوڈر چھڑکا اور باہر نکل آئی۔

دوسری طرف نجمہ نے میر صاحب سے اور فرمائش کر دی۔

اس نے کہا:

"شہر میں میرا جی گھبراتا ہے۔ میرا دل کہتا ہے کہ مری کے پہاڑوں میں اپنی ایک چھوٹی سی کوٹھی ہونی چاہیئے۔ میں نے یہ پتہ کر لیا ہے دس پندرہ ہزار میں ایسی ایک چھوٹی سی کوٹھی مری کے قریب و جوار میں بن جاتی ہے۔ کیا ہی اچھا ہو کہ وہاں آپ ایک چھوٹی سی کوٹھی بنوالیں۔ پھر ہم وہاں جا کر رہیں گے اور دنیا کو کانوں کان خبر نہ ہو گی۔"

میر صاحب پہلے تو خاموش رہے۔ پھر انہوں نے سوچا کہ نجمہ بالکل درست کہہ رہی ہے۔ اگر مری کے قریب کوئی کوٹھی بن جائے تو کیا مضائقہ ہے۔ دس پندرہ ہزار میں بات بن جائے گی۔ مکان الگ ہوگا۔ دور دراز مقام پر ہوگا۔ وہ کھلے بندوں نجمہ سے محبت کر سکیں گے۔ کسی کو خبر نہ ہوگی اور کوئی ان کی مخبری کرنے والا نہ ہوگا۔ باقی رہا دس پندرہ ہزار کا خرچ تو جہاں سے پہلے اتنی رقم آئی ہے' وہاں سے اگر دس پندرہ ہزار روپے اور نکال لئے جائیں تو کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ انہوں نے نجمہ کے رخساروں پر انگلیاں پھیرتے ہوئے کہا:

"اگر تمہاری یہی خواہش ہے تو میں تیار ہوں لیکن میری ایک شرط ہے۔"

نجمہ نے آنکھیں جھکا کر پوچھا۔

"وہ کیا؟"

میر صاحب نے آرام سے کہا:

"تم جانتی ہو نجمہ کہ میں تم سے محبت ہی نہیں کرتا بلکہ تمہاری پوجا کرتا ہوں ۔ میں تمہیں اپنے من مندر کی دیوی سمجھتا ہوں اور بس اب تمہارے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا ۔ چنانچہ میں نے تم سے شادی کا فیصلہ کر لیا ہے اور جیسا کہ تم نے مجھے کہا تھا کہ تم بھی مجھ سے شادی کرنے پر تیار ہو ۔ بس اگر تم ایسا کرو کہ پہاڑ پر جا کر ہم شادی کر لیں تو میں آج ہی وہاں مکان خریدنے کا بندوبست کر لیتا ہوں ۔"

نجمہ جو کہ بڑی مکار عورت تھی ، فوراً چوکنی ہو گئی ۔ سمجھ گئی کہ میر صاحب الٹا تیر نشانے پر مارنا چاہتے ہیں مگر اس نے سوچا شادی میں کیا حرج ہے ۔ وہ شادی کے بعد آسانی سے میر صاحب کو چھوڑ سکتی ہے کیا اس نے اس سے پہلے دو خاوندوں کو طلاق نہیں دی ؟ مگر نجمہ شادی سے پہلے میر صاحب کو جی بھر کر لوٹنا چاہتی تھی ۔ وہ جانتی تھی کہ شادی کے بعد میر صاحب کا جوش عشق سرد پڑ جائے گا اور پھر ان سے روپیہ نکالنا مشکل ہو جائے گا ۔ چنانچہ وہ شادی کے پروگرام کو ہر ممکن طریقے سے زیادہ سے زیادہ ملتوی کرتی چلی آ رہی تھی ۔ اس نے میر صاحب کے کندھے پر سر رکھ کر کہا:

"میرے لئے اس سے بڑی اور کیا خوشی کی بات ہو گی کہ میں آپ سے شادی کر لوں ۔ یہ تو میری زندگی کا انتہائے مقصود ہے لیکن آپ جانتے ہیں میں ڈرپوک عورت ہوں ۔ زندگی نے مجھے بڑے گہرے زخم لگائے ہیں ۔ ڈرتی ہوں ۔ آج آپ مجھ سے محبت کر رہے ہیں کہیں کل مجھ سے بیزار ہو کر مجھے چھوڑ کر نہ چلے جائیں ۔"

میر صاحب نے نجمہ کا منہ چوم کر کہا:

"ایسا ہونا ناممکن ہے ۔ تم ابھی تک میری محبت کو سمجھ ہی نہیں سکیں ۔ تمہیں معلوم ہی نہیں ہو سکا کہ میری محبت میں میری زندگی اور میرے جذبات کا کونسا جذبہ کارفرما ہے ۔ میں سچ کہتا ہوں نجمہ ! اگر مجھے کبھی تمہاری خاطر اپنی زندگی بھی قربان کر دینا پڑی تو میں دریغ نہیں کروں گا ۔"

نجمہ کو اس جملے نے بڑا مزا دیا ۔ اگر وہ میر صاحب سے سچی محبت کر رہی ہوتی تو اس جملے پر اپنی ساری زندگی کی بازی لگا دیتی ۔ لیکن وہ تو میر صاحب سے کھیل کھیل رہی تھی ، چال چل رہی تھی ، انہیں دھوکا دے رہی تھی ۔ پھر بھی اس جملے کی سچائی متاثر کئے بغیر نہ رہ سکی ۔ اس فقرے میں محبت اپنے پورے عروج پر تھی اور ایک بالکل مخلص ذہن انتہائی دیانت داری سے کام کر رہا تھا ۔

نجمہ نے میر صاحب کا ہاتھ تھام لیا ۔

"میں جانتی ہوں آپ مجھ سے بے پایاں محبت کرتے ہیں ۔ اور مجھے زندگی میں کبھی کوئی ایسا آدمی نہیں ملا جس نے مجھ سے اتنی شدت سے محبت کی ہو ۔ مگر میں کیا کروں ۔ میں ڈرتی ہوں ۔ مجھے زندگی میں ہمیشہ دھوکا دیا گیا ہے ۔ ہمیشہ ٹھکرایا گیا ہے ۔ ہمیشہ چشمۂ حیواں کے قریب لاکر حیات جاوداں سے محروم کیا گیا ہے ۔ لیکن میں آپ پر بھروسہ کرتی ہوں اور صرف چند سالوں کی مہلت مانگتی ہوں ۔"

"چند سالوں کی مہلت تو بڑی دور کی بات ہے ۔ میں تم سے اسی سال شادی کرنا چاہتا ہوں نجمہ ! تم جانتی ہو کہ میں شادی شدہ آدمی ہوں ۔ میرا ایک گھر ہے ۔ ایک گھریلو زندگی ہے ۔ بیٹا جوان ہے ۔ اس کے باوجود میں تمہاری خاطر ، اپنی محبت کی خاطر ان سب باتوں کو پس پشت ڈال رہا ہوں ۔ تو کیا تم میری ان قربانیوں کا ذرا بھی خیال نہ کرو گی ؟"

نجمہ نے سنجیدگی سے کہا:

"کیوں نہیں ، کیوں نہیں ! میں آپ کی قربانیوں کو سر آنکھوں پر جگہ دیتی ہوں ۔ پھر بھی میں چاہتی ہوں کہ مجھے اپنی زندگی کو پھر نئے راستے پر لانے کے لئے کچھ مہلت مل جائے ۔ میں نئی زندگی شروع کر رہی ہوں ۔ میں پرانی زندگی کی تلخ یادوں کو یکسر دل سے مٹا دینا چاہتی ہوں ۔"

"تو پھر تم ایک سال کے بعد مجھ سے شادی کر سکتی ہو ۔"

"ہاں ! جب آپ مری میں میرے لئے مکان خرید لیں تو میں وہاں جا کر آپ سے شادی کر لوں گی ۔ اس کے بعد ہم دونوں وہاں رہیں گے ۔ آپ کو چاہیئے کہ یہاں آکر اپنا کاروبار کرتے رہیں ۔ میں وہیں پہاڑوں کی پر فضا وادیوں میں رہوں گی اور آپ کی محبت کی یادگاروں کی حفاظت کروں گی ۔ میں کبھی آپ کو یہ نہیں کہوں گی کہ آپ شہر میں آکر کس کس کے ساتھ رہتے ہیں اور کیوں زیادہ دیر رہتے ہیں ۔ پھر میں آپ کو اپنی محبت کے دامن میں لے کر آزاد کروں گی ۔"

میر صاحب نے نجمہ کو اپنی آغوش میں لے کر کہا:

"اگر یہ بات ہے تو میں کل ہی مری جا کر مکان خریدنے کی کوشش کرتا ہوں ۔ اگر خرید نہ سکا تو بنوانا شروع کر دوں گا ۔ لیکن مجھے یقین ہے وہاں کوئی نہ کوئی مکان ضرور مل جائے گا ۔"

اسی ہفتے میر صاحب نے سیکرٹری کو ساتھ لیا اور دفتر سے چند یوم کی چھٹی لے کر گھر میں دورے کا بہانہ بنا کر روانہ ہو گئے ۔ مری کے قرب و جوار میں وہ جائیدادوں کے ایجنٹوں سے ملے ۔ انہوں نے مری سے چند میل کے فاصلے پر انہیں دو تین کوٹھیاں دکھلائیں ۔ انہیں ایک کوٹھی پسند آئی ۔ یہ سبز رنگ کی چھتوں اور درودیوار والی کوٹھی پہاڑ کے دامن میں ایک چشمے کے پاس واقع تھی اور چیڑ کے درختوں میں گھری ہوئی تھی ۔ پندرہ ہزار روپے پر سودا ہو گیا ۔ میر صاحب نے دو

ہزار روپے انہیں بیعانہ دیا اور لاہور واپس آگئے۔ یہاں آکر انہوں نے اسی گمنام آدمی کے نام پر بیس ہزار کا ایک چیک لکھا۔ چیک پر اپنے دستخط کئے اور کیش کروا کر روپیہ نکلوا لیا۔ دوسرے روز انہوں نے مری جا کر روپیہ ادا کیا۔ مکان کی ملکیت کے حقوق حاصل کئے اور مکان پر اپنا نام لگا کر واپس لاہور آگئے۔ لاہور آکر انہوں نے نجمہ کو بتایا کہ کوٹھی خرید لی گئی ہے۔ نجمہ بے حد خوش ہوئی اور اسے دیکھنے کے لئے پرویز کو ساتھ لیکر مری چل پڑی۔

کوہ مری والی کوٹھی نجمہ کو بہت پسند آئی۔

لیکن ابھی اس کی کچھ ضروری مرمتیں ہونے والی تھیں۔ اس کے علاوہ سردیوں کا موسم شروع ہو چکا تھا اور ابھی پہاڑ پر جانے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا۔ پرویز نے نجمہ کو پٹی پڑھائی کہ کوٹھی کے مالکانہ حقوق اپنے نام منتقل کروالو۔ نجمہ نے کہا ابھی زخم تازہ تازہ ہیں۔ کچھ وقت گزرجائے گا تو سارا معاملہ درست کر لیا جائے گا۔ نجمہ نے میر صاحب سے کہہ دیا کہ کوٹھی اسے بہت پسند آئی ہے اور یہ کہ انہوں نے جس فیاض دل سے نجمہ کو اپنی بے پایاں محبت کا ثبوت دیا ہے اس سے وہ بے حد متاثر ہوئی ہے۔ میر صاحب نے کہا کہ یہ تو ان کی محبت کی ایک ادنیٰ سی مثال ہے۔ کاش! وہ ان کی محبت کا کوئی اعلیٰ روپ دیکھ سکے مگر نجمہ کے لئے محبت کا اس سے اعلیٰ روپ کوئی نہیں تھا کہ میر صاحب اسے ہر ماہ کثیر رقم دیتے رہا کریں اور وہ ان روپوں سے گلچھرے اڑایا کرے۔

اس روز نجمہ نے اپنی کوٹھی میں میر صاحب کی دعوت کر رکھی تھی۔ موسم سرد تھا۔ شام ہی سے سردی نے اپنا جوبن دکھانا شروع کر دیا تھا۔ پورے آٹھ بجے میر صاحب تشریف لائے۔ پرویز اور نجمہ نے باہر ان کا خیر مقدم کیا۔ میر صاحب کو یہ لوگ اندر لے گئے۔ اندر بیٹھتے ہی ادھر ادھر کی باتوں کے بعد شراب کا دور چل پڑا۔ نجمہ خود ساغر بھر بھر کر میر صاحب کو پلا رہی تھی۔ تیسرے جام کے بعد میر صاحب نے ہاتھ روک لیا۔ وہ قصداً زیادہ نہیں پینا چاہتے تھے۔ کیونکہ رات کو انہیں اپنے گھر بھی جانا تھا۔ اس کے بعد وہ تینوں کھانے کی میز پر جا بیٹھے۔ کھانے کے دوران بڑی پُرلطف باتیں ہوتی رہیں۔ نجمہ میر صاحب کے بالکل سامنے بیٹھی تھی۔ اس نے بڑے خوبصورت کپڑے پہن رکھے تھے۔ ریشمی کرتی نے اس کے نیم عریاں سینے کے ابھار کو اور زیادہ نمایاں کر دیا تھا۔ میر صاحب کا جی وہاں سے گھر جانے کو نہیں چاہ رہا تھا۔

کھانے کے بعد پرویز نے سردرد کا بہانہ بنایا اور کلب چلا گیا۔ اب وہاں نجمہ اور میر صاحب دونوں اکیلے رہ گئے۔ میر صاحب نے نجمہ کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر اس کی طرف محبت بھری نظروں سے دیکھ کر کہا:

"اب صرف ایک حسرت دل میں باقی رہ گئی ہے کہ تم سے شادی کرلوں اور تمہارے ساتھ پہاڑ والی کوٹھی میں زندگی کے انتہائی یادگار دن بسر کروں۔"

نجمہ نے مسکرا کر کہا:

"بہت جلد یہ بھی حسرت پوری ہو جائے گی۔ میری اپنی یہی خواہش ہے کہ آپ کے ساتھ لگ کر زندگی کے باقی دن انتہائی خاموشی اور سکون کے ساتھ گزاردوں لیکن کیا کروں۔ ان دنوں کچھ طبیعت ٹھیک نہیں رہتی۔ دن بھر سر میں درد ہی رہنے لگا ہے۔"

میر صاحب نے پریشان ہو کر پوچھا:

"تم نے مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا؟ کل ہی میں تمہیں اپنے ڈاکٹر دوست کے ہاں لے چلوں گا۔"

"نہیں، اس کی کیا ضرورت ہے۔ میں نے بہت سی دوائیاں کھائی ہیں۔ مگر افاقہ ہی نہیں ہوتا۔ اپنے آپ ہی آرام آجاتا ہے اور اپنے آپ ہی درد شروع ہو جاتا ہے۔ خیر ان باتوں کو چھوڑیئے۔ آخر ایک نہ ایک روز تو ہمیں ایک دوسرے سے منسلک ہونا ہی ہے۔"

میر صاحب نے سگریٹ سلگا کر کہا۔

"تم ٹھیک کہتی ہو نجمہ! مگر میری کچھ دوسری ذمہ داریاں بھی ہیں۔ چاہتا ہوں جتنی جلدی ہو یہ شادی کرلوں اور پھر دوسرے کاموں کی طرف پوری توجہ سے محنت کر سکوں۔"

نجمہ نے شرما کر کہا:

"کیا شادی کے بعد آپ مجھے چھوڑ کر تو نہیں چلے جائیں گے۔"

میر صاحب نے نجمہ کا ہاتھ چوم لیا۔

"سورج روشنی سے الگ ہو سکتا ہے۔ ستارے اپنی چمک کو کھو سکتے ہیں مگر نجمہ میں تمہیں کبھی نہیں چھوڑ سکتا۔ تم تو ان باتوں کو کبھی دھیان میں لایا ہی نہ کرو۔"

نجمہ نے کہا:

"اگر آپ کی بیگم کو اس شادی کا علم ہوگیا جیسا کہ ظاہر ہے ایک نہ ایک روز انہیں معلوم ہو کر رہے گا تو آپ انہیں کیا جواب دیں گے؟"

"بیگم بڑی صبر والی عورت ہے۔ پھر مسلمان چار شادیاں کر سکتا ہے۔ ذہنی طور پر ہر مسلمان عورت اپنے مرنے تک سوکن کو برداشت کرنے کے لئے تیار رہتی ہے۔ بیگم کو میں سمجھا لوں گا۔"

"انہوں نے اگر اس کا بُرا مانا اور آپ کا گھر چھوڑ کر چلی گئیں تو؟"

میر صاحب مسکرائے۔

"وہ گھر چھوڑ کر اور کہیں نہیں جا سکتیں۔ فکر نہ کرو۔ اس کے علاوہ میری بیوی انتہائی

خاموش طبع ، بردبار اور نیک عورت ہے وہ اندر ہی اندر گھل کر مرجائے گی لیکن حرف شکایت لب تک نہ لائے گی۔"

نجمہ بولی:

"کیا آپ مجھ سے انہی شخصی صلاحیتوں کی توقع رکھیں گے ؟ یعنی یہ کہ میں بھی ایسی ہی بردبار اور متحمل مزاج بیوی بنوں ؟"

میر صاحب ہنس دیئے۔

"فکر نہ کرو نجمہ ! میں تیسری شادی کبھی نہیں کر سکتا۔"

نجمہ نے منہ بنا کر کہا:

"مردوں کا کیا اعتبار؟"

میر صاحب نے نجمہ کو اپنی آغوش میں لیکر اس کا منہ چوم لیا۔

"میں تم سے وعدہ کرتا ہوں نجمہ کہ سوائے تمہارے اور کسی کی طرف کبھی آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھوں گا اور پھر میری عمر کا تقاضا بھی یہی ہے کہ مجھے تیسری شادی نہیں کرنی چاہیئے۔"

نجمہ نے میر صاحب سے الگ ہو کر کہا:

"مرد اسّی کی عمر میں بھی شادی کر لیتا ہے۔"

میر صاحب بولے

"میں زیادہ دیر تک زندہ نہیں رہوں گا نجمہ ! محبت اگر انسان کو خوشی دیتی ہے تو اسے بہت جلد ہلاک بھی کر دیتی ہے۔ بہرحال ان باتوں کو چھوڑو اور اب میری آغوش میں آجاؤ۔"

اس سے پہلے کہ نجمہ کچھ ناز نخرے کرتی اچانک دروازے کی گھنٹی بجی۔ خادمہ نے آکر کہا:

"جی اسلم صاحب آئے ہیں۔"

میر صاحب نے چونک کر کہا:

"کون اسلم ؟"

نجمہ گھبرا گئی۔

"کوئی نہیں آپ ذرا اندر چلے جائیے۔ میں آپ کو سب کچھ بتا دوں گی۔ آپ تھوڑی دیر کے لئے دوسرے کمرے میں چلے جائیے۔"

میر صاحب جلدی سے دوسرے کمرے میں چلے گئے۔ لیکن وہ کیواڑ کی جھری سے دیکھتے رہے خادمہ کے جانے کے بعد اچانک دروازہ کھلا اور سامنے اسلم نمودار ہوا، اسلم جو میر صاحب کا لڑکا تھا۔

میر صاحب دھک سے رہ گئے۔ انہیں پسینہ آگیا۔ اسلم نے اندر آتے ہی نجمہ کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیکر اسے بوسہ دیا۔ اور صوفے پر بیٹھ کر نجمہ سے باتیں شروع کر دیں۔ یہ وہی ہاتھ تھا جسے تھوڑی دیر پہلے اسلم کے باپ نے چوما تھا۔ نجمہ گھبرائی ہوئی سی مگر بڑی خندہ پیشانی سے اسلم سے ہم کلام تھی۔ اسلم کہنے لگا۔

"میں آج تمہارے سامنے اپنا دل کھولنے آیا ہوں نجمہ ! تم تو جانتی ہو کہ میں تم سے کس قدر پیار کرتا ہوں۔ میرا پیار صرف آج ہی سے نہیں بلکہ ایک مدت سے تمہارے قدموں پر نچھاور ہوتا رہا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ میں اب تمہارے بغیر نہیں رہ سکتا۔ میرے گھر والے میری شادی میری چچا زاد سے کرنا چاہتے ہیں۔ میں تم سے پیار کرتا ہوں۔ پھر اس سے شادی کس طرح کر سکتا ہوں ؟"

بہت بے غیرت انسان ہے

نجمہ پریشان سی ہوگئی۔

"تم کتنے نادان ہو اسلم ! تم اچھی طرح جانتے ہو کہ میں کسی سے بھی شادی نہیں کر سکتی۔ میں نے قسم کھا رکھی ہے کہ شادی کبھی نہیں کروں گی۔ پھر تم کیوں خواہ مخواہ اپنی زندگی خراب کر رہے ہو۔ میری مانو اور جہاں ماں باپ کہہ رہے ہیں، وہاں شادی کرلو۔"

اسلم جوش میں آکر کمرے میں ٹہلنے لگا۔

"ہرگز نہیں، ہرگز نہیں۔ میں کبھی یہ شادی نہیں کر سکتا۔ میں کوئی بیل نہیں ہوں۔ انسان ہوں۔ مجھے اپنی زندگی کے بارے میں خود فیصلہ کرنے کا پورا پورا حق ہے۔ میں تم سے محبت کرتا ہوں اور صرف تم سے شادی کروں گا۔"

نجمہ کہنے لگی۔

"مگر یہ تو اسی صورت میں ہو سکتا ہے جب کہ میں بھی تم سے شادی کرنے پر تیار ہوں۔"

"کیا تم تیار نہیں ہو نجمہ ؟"

"بالکل نہیں۔ میری تیاری کا تو سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔"

"کیوں ؟"

"اسلئے کہ میں نے عمر بھر کنواری رہنے کی قسم کھا رکھی ہے۔ میں کبھی شادی نہیں کر سکتی۔"

"کیا تمہیں مجھ سے محبت نہیں ہے ؟"

نجمہ نے سگریٹ سلگایا۔ اٹھ کر اسلم کے قریب آئی۔ ان کے کندھے پر بڑی محبت سے ہاتھ رکھا اور ملامت سے بولی:

"اسلم! تم ابھی بچے ہو۔ بڑے بھولے اور معصوم ہو۔ مانا کہ تم عشق کرنے لگے ہو اور شراب بھی پیتے ہو اور بڑے ہی چالاک بنتے ہو لیکن حقیقت یہ ہے کہ زندگی کے مکتب میں ابھی تم نے پہلا قاعدہ بھی ختم نہیں کیا۔ تمہیں چاہیئے کہ جی لگا کر پڑھائی کرو۔ ماں باپ کی فرمانبرداری کرو۔ ان کی خدمت کرو۔ ان کے حکم......"

اسلم نے نفرت سے سر جھٹک کر فقرہ کاٹ دیا۔

"میں تم سے شادی کی بات کرنے آیا ہوں --------- تم سے مولویوں ایسی نصیحتیں سننے نہیں آیا نجمہ! اتنے خوبصورت ہونٹ اور آنکھیں رکھ کر تم کسی کو نصیحت نہیں کر سکتیں۔"

نجمہ اپنی تعریف سن کر خوش ہوئی۔

"یہ نصیحت نہیں اسلم! بلکہ تمہاری بھلائی کی باتیں ہیں۔"

"جہنم میں جائیں ایسی باتیں۔ میں تم سے محبت کرنے آیا ہوں اخلاقِ جلالی کا درس لینے نہیں آیا۔"

اس کے بعد اسلم نے مفلر اٹھا کر گردن کے گرد لپیٹا۔ سگریٹ کو زور سے راکھ دان میں مسلا اور باہر نکل گیا۔ میر صاحب دوسرے کمرے میں کواڑ کے ساتھ لگے یہ تماشا دیکھتے رہے اور سارے مکالمے سنتے رہے تھے۔ انہیں کبھی خواب میں بھی یہ وہم نہیں گزر سکتا تھا کہ اسلم --- ان کا بیٹا اسلم اس عورت کے عشق کا دم بھر رہا ہو گا جس سے وہ محبت کر رہے ہیں بلکہ جس سے ان کی شادی کی بات چیت طے ہو گئی ہے۔

اسلم کے چلے جانے کی بعد وہ باہر نکل آئے۔ نجمہ نے شرمساری سے سر جھکا لیا۔ میر صاحب چپ چاپ صوفے پر بیٹھ گئے۔ نجمہ نے کچھ لمحے کی خاموشی کے بعد کہا:

"اسلم نادان ہے۔ میں نے اسی لئے کبھی آپ سے اس بات کا ذکر نہیں کیا تھا کہ بچہ ہے۔ خود بخود سمجھ جائے گا۔ کیونکہ میں تو اس سے کبھی محبت نہیں کر سکتی۔ وہ جب سے کلب میں آنا شروع ہوا ہے۔ مجھ سے گاہے گاہے اپنی محبت کا اظہار کرتا رہا ہے لیکن میں نے کبھی اس کی حوصلہ افزائی نہیں کی تھی اور نہ کر سکتی تھی۔ کیونکہ اس سے مجھے محبت ہی نہیں ہے۔"

میر صاحب آہستہ سے بولے:

"تم نے مجھ سے اس کا ذکر کیوں نہیں کیا؟"

"صرف یہ سوچ کر چپ رہی کہ بات کرنے والی نہیں۔ کس منہ سے آپ سے کہتی کہ آپ کا بیٹا بھی مجھ سے عشق کر رہا ہے۔ مجھے شرم آتی تھی۔ جب کہ میں اس سے محبت ہی نہیں کرتی۔ میرا خیال تھا کہ جب ہماری شادی ہو جائے گی تو وہ اپنے آپ سمجھ جائے گا۔"

پھر اس نے آگے بڑھ کر میر صاحب کے گلے میں بانہیں ڈال دی اور جھوٹ موٹ کے آنسو

آنکھوں میں لا کر بولی:

"مجھے معاف کر دیجئے۔ میں نے آپ کو دکھ دیا۔ اس کی مجھے بڑی شرمندگی اور افسوس ہے۔ آئندہ کبھی آپ کو شکایت کا موقع نہیں دوں گی۔"

میر صاحب پر گہری سنجیدگی طاری تھی۔

"لیکن اسلم کو کیسے الگ کیا جائے۔ اس نے ہمارے راستے میں ایک بہت بڑی دیوار کھڑی کر دی ہے۔ تم اس کی طبیعت سے واقف نہیں ہو۔ وہ ہماری بدنامی اور تباہی کا بہت بڑا سبب بن سکتا ہے۔"

نجمہ نے میر صاحب کی پیشانی چوم کر کہا:

"آپ نا امید کیوں ہوتے ہیں؟ کیا آپ اس کی پہلے شادی نہیں کر سکتے؟"

"ایسا ہی کرنا پڑے گا۔ اچھا! اب میں چلتا ہوں۔"

اتنا کہہ کر میر صاحب اٹھے۔ نجمہ کو گردن پر جھک کر بوسہ دیا اور کمرے سے باہر نکل آئے۔ نجمہ انہیں چھوڑنے باہر تک آئی۔

میر صاحب کو رخصت کر کے نجمہ خود گاڑی میں بیٹھی اور سیدھی کلب میں آگئی۔ یہاں آکر اس نے پرویز کو ساری بات سنا دی۔ پرویز نے بڑی تشویش کا اظہار کیا۔

"تم سے بڑی غلطی ہو گئی۔ تمہیں اسلم کا معاملہ پہلے ہی روز میر صاحب کے گوش گزار کر دینا چاہیئے تھا۔ اب خطرہ ہے کہ پوری طرح پھنسا ہوا شکار کہیں ہاتھ سے نہ نکل جائے۔"

نجمہ نے بالوں میں ہاتھ پھیر کر کہا:

"خیر ایسا تو کبھی نہیں ہو سکتا۔ میں نے میر صاحب کو مطمئن کر دیا تھا۔ اس کے علاوہ وہ میری محبت میں اتنی دور نکل گئے ہیں کہ اب ان کا واپس آنا محال ہی نہیں ناممکن ہے۔"

میر صاحب نے گھر جا کر گرم پانی سے غسل کیا ---- سگریٹ جلایا اور اپنے پلنگ پر کمبل اوڑھ کر بیٹھ گئے۔ ان کی بیگم بھی قریب ہی پلنگ پر بیٹھی اسلم کا سویٹر بن رہی تھی ---- میر صاحب نے اسلم کے بیاہ کی بات شروع کر دی۔ بیگم نے کہا:

"اتنی جلدی بھی کیا ہے۔ ابھی وہ پڑھ رہا ہے۔ امتحان پاس کر لے تو دیکھا جائے گا۔"

"نہیں بیگم! میں اس کام کو جلدی کر دینا چاہتا ہوں۔ زمانہ بڑا خراب ہے۔ آج کل لڑکیاں بہت کم اور لڑکے بہت زیادہ اور بہت جلدی خراب ہو جاتے ہیں۔ اچھا ایک بات تو بتاؤ۔ کیا تمہارا خیال ہے کہ اسلم سلمہ سے شادی کرنے پر راضی ہو جائے گا۔"

بیگم نے منہ لٹکا کر کہا۔

"خیال تو نہیں کہ وہ راضی ہو۔ کیونکہ اس نے ایک بار مجھ سے دبی زبان میں کہا بھی تھا کہ میں سلمہ سے شادی نہیں کرنا چاہتا۔ مگر آخر وہ ہمارا بیٹا ہے اور سلمہ اپنی بچی ہے۔"

اسلم انکار نہیں کر سکے گا۔"

"اچھا! تو صبح اس سے بات کی جائے گی۔"

اس کے بعد بیگم سو گئیں لیکن میر صاحب کتنی ہی دیر تک جاگتے رہے۔

دوسرے روز اتوار تھا۔ میر صاحب نے اسلم کو ناشتے کے بعد اپنے کمرے میں بلایا اور شادی کی بات شروع کر دی۔ اس وقت وہاں بیگم اور میر صاحب دونوں موجود تھے۔ انہیں اس بات

میر صاحب ہر حالت میں اسلم کی شادی کر دینا چاہتے تھے۔

سے زیادہ سروکار نہیں تھا کہ اسلم سلمہ سے شادی کرتا ہے یا کسی دوسری عورت سے۔ وہ تو سوائے نجمہ کے دنیا کی ہر عورت سے اسلم کی شادی کر دینا چاہتے تھے۔ پہلے تو اسلم چپکے سے اپنے باپ کی گفتگو سنتا رہا۔ پھر آہستہ سے بولا۔

"میں یہ شادی نہیں کرنا چاہتا۔"

"کیا مطلب ہے تمہارا" میر صاحب نے پوچھا۔

اسلم خاموش ہو گیا۔ بیگم نے کہا۔

"بولتا کیوں نہیں۔ جو دل میں ہے صاف صاف کیوں نہیں کہہ دیتا۔"

اسلم نے کہا۔

"میں سلمہ سے شادی نہیں کرنا چاہتا۔ میں اسے پسند نہیں کرتا۔"

دوسری طرف کیواڑ کے ساتھ لگی سلمہ یہ ساری باتیں سن رہی تھی، جب یہ جملہ اس کے کان میں پڑا تو دل تھام کر رہ گئی۔ آنکھوں میں آنسو آ گئے اور پلنگ پر گر کر زار و قطار رونے لگی۔

"آخر کوئی وجہ بھی تو ہونی چاہیے؟"

"بس مجھے یہ لڑکی پسند نہیں۔ میں اس کے ساتھ زندگی نہیں گزار سکتا"۔

"تو پھر کسی دوسری جگہ تمہاری شادی کر دیتے ہیں۔ اس شہر میں تو کئی ایک شریف گھرانے کی لڑکیاں ہیں جن میں سے ایک کو میں بخوشی اپنی بہو بنا کر گھر لا سکتا ہوں"۔

"میں کسی عورت سے بھی شادی نہیں کرنا چاہتا"۔

"کیا تم مجھے بے وقوف بنا رہے ہو۔ تم صاف صاف بات کیوں نہیں کرتے؟"۔ میر صاحب نے گرج کر کہا۔

اسلم نے غصے سے کہا۔ "آپ مجھے شادی پر کیوں مجبور کر رہے ہیں؟ میں نے کہہ دیا کہ میں کسی سے بھی شادی نہیں کرنا چاہتا۔ میں شادی کے خلاف ہوں۔"

میر صاحب کھڑے ہو گئے۔ انہوں نے ایک پیڑا اسلم کے مارا اور گرج کر بولے۔

"کم بخت! بکواس کر رہا ہے اور راتوں کو اس فاحشہ کلب والی عورت کے گھر جا کر شادی کی درخواستیں کرتا ہے اور یہاں کہتے ہو کہ میں عمر بھر شادی نہیں کروں گا۔ تم کیا سمجھتے ہو کہ میں نے آنکھوں پر پٹی باندھ رکھی ہے۔ جس میدان میں تم نے ابھی قدم ہی رکھا ہے میں اس کی اینٹ سے اینٹ بجا چکا ہوں۔"

اسلم تو حیران رہ گیا۔ بیگم بھی حیران رہ گئی کہ یہ شگوفہ کیسے کھل اٹھا۔ بیگم نے کہا۔

"آخر وہ کون حرامزادی ہے جس نے میرے بچے پر ڈورے ڈال رکھے ہیں؟ آپ نے پہلے مجھ سے اس کا ذکر تک کیوں نہیں کیا؟"

میر صاحب نے کہا۔

"کس منہ سے ذکر کرتا۔ اس حرامزادے کو تو ذرا حیا نہیں۔ ذرا شرم نہیں۔ سن رکھو! اگر ایک ہفتے کے اندر اندر تم نے ہماری مرضی کے مطابق شادی نہ کی تو میں تمہیں نہ صرف یہ کہ تمہیں گھر سے نکال دوں گا بلکہ زندگی بھر تمہارا نام نہیں لوں گا"۔

اسلم نے کوئی جواب دینے کی بجائے چپکے سے اپنا کوٹ اٹھا کر کندھے پر ڈالا اور باہر نکل گیا۔ بیگم نے کہا۔

"کہاں جا رہے ہو؟"

"جہاں قسمت لے جائے۔"

بیگم نے روتے ہوئے میر صاحب کا بازو تھام لیا۔

"خدا کے لئے میرے بچے کو واپس بلا لیجے۔ وہ کبھی یہاں واپس نہیں آئے گا۔ اسے گھر سے مت نکالئے۔"

"بیگم! میرے لئے وہ مر چکا ہے۔ اگر تمہیں اس کا زیادہ درد ہے تو تم بھی اس کے ساتھ چلی جاؤ۔"

اتنا کہہ کر میر صاحب تیزی سے اپنے کمرے کی طرف مڑ گئے۔ بیگم نے روتے ہوئے اپنے بچے کو آوازیں دیں مگر وہ وہاں سے باہر جا چکا تھا۔ سلمٰی بھی روتی رہی اور بیگم کو تسلیاں دیتی رہی۔ دونوں عورتیں کتنی ہی دیر تک کمرے میں ایک دوسرے سے لگ کر آنسو بہاتی رہیں۔

ایک ہفتہ گزر گیا لیکن اسلم گھر واپس نہ آیا۔ اس کی ماں اپنے بیٹے کی جدائی کے غم میں بیمار ہو گئی۔ سلمہ بھی غم سے نڈھال ہو گئی تھی۔ اسے دوہرا غم تھا۔ ایک تو اسلم کے بچھڑنے کا صدمہ اور پھر دوسرا اس بات کا کہ اسلم سلمہ سے محبت نہیں کرتا بلکہ اسی سے دور رہنے کے لئے وہ گھر چھوڑ گیا ہے۔

میر صاحب کو بھی تھوڑا سا صدمہ تھا مگر آخر وہ مرد تھے۔ انہوں نے دل پر نہ لگایا۔ اس

کے علاوہ ان کا بیٹا ان کا رقیب بھی تھا۔ ان کی بیگم نے ان سے بہتیرا رونا رویا کہ کسی طرح ان کے بچے کو گھر میں واپس بلا لیں لیکن میر صاحب ہر بار یہی کہتے کہ انہیں خود اس کا علم نہیں ہے کہ وہ کہاں ہے۔

"اس کے علاوہ وہ گستاخ ہے۔ اس نے میری بے عزتی کی ہے۔ میں اسے کبھی اس گھر میں گھسنے نہیں دوں گا۔ آئندہ کوئی مجھ سے اسلم کی بات نہ کرے۔"

بیگم بے چاری سر پکڑ کر بیٹھ گئی۔ اس صدمے نے اسے بستر پر گرا دیا۔ سلمہ چوبیس گھنٹے ان کی خدمت کرتی رہتی۔"

اسلم گھر سے نکل کر سیدھا اپنے ایک دوست کے گھر گیا۔ اس سے کچھ روپیہ بطور قرض لیا اور نوکری کی تلاش شروع کر دی۔ چوتھے روز اسے ایک دفتر میں کام مل گیا۔ وہ سیدھا ایک ہوٹل میں آ کر رہنے لگا۔

میر صاحب کا راستہ کسی حد تک صاف ہو گیا تھا۔ انہوں نے نجمہ کو جا کر بتا دیا کہ اسلم کو گھر سے نکال دیا گیا ہے اور اب وہ کبھی ادھر کا رخ بھی نہیں کرے گا۔ کیونکہ اس کے پاس اتنے روپے نہیں ہوں گے کہ وہ نجمہ ایسی عورت کے عشق کا بوجھ اٹھا سکے اور ہوا بھی ایسا ہی۔ ایک مہینہ گزر گیا اور اسلم نجمہ سے بالکل ملنے نہ آیا۔ وگرنہ ہر دوسرے روز وہ اس کے پاس آ کر محبت کا اظہار کیا کرتا تھا۔ اس دوران میں میر صاحب کھلے بندوں ہر روز شام کو نجمہ کے پاس آتے۔ رقص و سرور کی محفلیں برپا ہوتی۔ ساغر و مینا کا دور چلتا۔ محبت کی طویل ہم آغوشیاں ہوتیں اور میر صاحب واپس گھر چلے جاتے۔

ڈیڑھ مہینہ اسی بادہ نوشی اور عیش و عشرت میں گزر گیا۔

ایک روز نجمہ اپنی کوٹھی میں بیٹھی شام کے وقت سنگار کر رہی تھی۔ میر صاحب ابھی نہیں آئے تھے کہ اسلم اندر داخل ہوا۔ نجمہ اسے دیکھ کر حیران رہ گئی۔ اس کی حالت پہلے سے بھی پتلی ہو رہی تھی۔ اس کے کپڑے معمولی قسم کے تھے اور چہرہ بھی پہلے سے کمزور ہو گیا تھا۔ نجمہ نے بظاہر مسکرا کر پوچھا۔

"اتنے دن کہاں رہے؟"

اسلم نے زبان ہونٹوں پر پھیر کر کہا۔

"نجمہ! تمہیں شاید معلوم نہیں۔ میں نے گھر چھوڑ دیا ہے۔"

"کیسے؟" نجمہ نے بھولپن سے پوچھا۔ جیسے کچھ معلوم ہی نہیں۔

"صرف تمہاری خاطر۔"

"وہ کیونکر؟"

"میرے ماں باپ میری شادی ایک ایسی لڑکی سے کرنا چاہتے تھے جس کو میں پسند نہیں کرتا۔ انہوں نے مجھے تمہارا طعنہ دیا۔ میں حیران ہوں کہ والد صاحب کو میری اور تمہاری اس رات کی باتوں کا کیسے علم ہو گیا۔ کیا تم نے کسی سے ذکر کیا تھا کہ میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں؟"

نجمہ نے سوچ کر کہا

"صرف پرویز سے میں نے یونہی ذکر کر دیا تھا"

"بس اسی ذلیل نے آگے بات کر دی ہو گی۔ بہرحال اب میں آزاد ہوں نجمہ! میں تم سے محبت کرتا ہوں اور صرف تم ہی سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔ اگرچہ میں پہلے کی طرح ایک امیر باپ کا بیٹا ہوں لیکن میرا دل اسی طرح تمہاری محبت سے لبریز ہے۔ میں ایک جگہ ملازم ہو گیا ہوں۔ اگر تم مجھ سے شادی کر لو تو میں ساری عمر تمہارے لئے محنت کروں گا اور تمہیں حلال کی روزی کما کر کھلاؤں گا۔"

نجمہ نے مسکرا کر اسلم کے گال تھپتھپائے۔

"برخوردار! تم خیالی جنت میں پھر رہے ہو۔ میں تم سے شادی کر کے اپنی زندگی جہنم میں نہیں ڈال سکتی۔ تم اگر ساری عمر بھی شب و روز محنت کرو تو میرا بوجھ برداشت نہیں کر سکو گے۔ بہتر یہی ہے کہ اس خیال کو بھول جاؤ اور اپنے ماں باپ کے پاس جا کر ان کی خدمت کرو۔"

اسلم نے نفرت سے کہا۔

"میرے گھر والوں کا ذکر میرے سامنے بالکل نہ کرو۔ میں ان سے نفرت کرتا ہوں۔ تم اپنی بات کرو۔ کیا تم مجھ سے شادی نہیں کرنا چاہتی۔"

نجمہ نے سر اٹھا کر کہا۔

"اگر تم صاف صاف جواب سننا چاہتے ہو تو سن لو۔ میں تم سے زندگی بھر شادی نہیں کر سکتی۔ اب تم یہاں سے چلے جاؤ اور پھر کبھی ادھر کا رخ مت کرنا۔ سمجھے؟"

اسلم بھونچکا سا ہو کر کھڑے کا کھڑا رہ گیا۔ اسے نجمہ سے اس قسم کے سنگدلانہ جواب کی قطعی امید نہیں تھی۔ وہ شرم سے پانی پانی ہو گیا۔ لیکن اب وہ وہاں ایک پل کے لئے بھی کھڑا نہیں رہنا چاہتا تھا۔ اس کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔ اس نے نجمہ کا بازو پکڑ کر زور سے اسے جھٹکا دیا اور اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولا۔

"میں جاتا ہوں لیکن اتنا یاد رہے کہ ایک روز تمہیں اپنے الفاظ پر پچھتانا ہو گا۔"

اس کے بعد اسلم تیزی سے باہر نکل گیا۔ نجمہ کو کچھ خوف سا محسوس ہوا۔ مگر پھر وہ اپنے آپ میں آ گئی۔ اس نے سگریٹ نکال کر سلگایا اور خادمہ سے کافی کی پیالی لانے کو کہا۔

رات کو میر صاحب آئے تو نجمہ نے انہیں سارا واقعہ سنا دیا۔ میر صاحب بھی کچھ پریشان

سے ہو گئے اور کسی سوچ میں پڑ گئے۔

"اس کا مطلب یہ ہے کہ مرنے مارنے پر اتر آیا ہے۔ میں اسے وہ سبق سکھاؤں گا کہ ساری عمر یاد رکھے گا۔"

نجمہ نے اداس ہو کر کہا۔

"میں نہیں چاہتی کہ میری وجہ سے آپ کو کوئی تکلیف اٹھانی پڑے۔ کیوں نہ کچھ روز پہاڑ والی کوٹھی پر جا کر گزار آئیں۔ جب تک یہاں معاملہ بھی ٹھنڈا پڑ جائے گا اور ہو سکتا ہے اسلم کو بھی ہماری عدم موجودگی میں عقل آ جائے۔"

میر صاحب بولے۔

"لیکن کہیں میرے بھی چلے جانے سے اسے شک تو نہیں پڑے گا۔"

"کیوں ---- آپ کہہ دیجئے کہ حیدر آباد یا کراچی دورے پر جا رہے ہیں۔ آپ دو روز پہلے چلے جائیں، میں بعد میں آ جاؤں گی۔"

"بہتر ہے میں کل ہی یہاں سے چلا جاتا ہوں۔ تم پرسوں رات یہاں سے روانہ ہو جانا۔ چوتھے روز صبح کو میں پنڈی سٹیشن پر تمہارا انتظار کروں گا۔"

یہ پروگرام طے کرنے کے بعد میر صاحب گھر آ گئے۔ انہوں نے بیگم کو بتایا کہ صبح وہ کراچی دورے پر جا رہے ہیں۔ انہوں نے ضروری سامان سوٹ کیس میں بند کر کے رکھ دیا۔ بستر وغیرہ بھی تیار کر دیا۔ دوسرے دن صبح بنک گئے۔ وہاں جا کر پندرہ یوم کی رخصت لی۔ سیکرٹری سے مل کر پانچ ہزار روپیہ بنک سے جعلی چیک لکھ کر نکلوایا۔ سٹیشن پر آئے اور پنڈی کی طرف روانہ ہو گئے۔

اسی رات وہ مری پہنچ گئے۔ جو کوٹھی انہوں نے نجمہ کے لئے خریدی تھی۔ اس کی ایک چابی ان کے پاس موجود تھی۔ یہ کوٹھی مری سے پانچ میل اس طرف تھی۔ انہوں نے چوکیدار کو جگایا۔ دروازے کھلوائے۔ بستر لگوایا' کھانا وہ پنڈی ہی سے کھا کر آئے تھے اور سو گئے۔ صبح اٹھ کر انہوں نے ساری کوٹھی کی صفائی کروائی۔ پنڈی سے لائے ہوئے پردے لگوائے۔ صوفوں پر کپڑا چڑھوایا۔ بستروں پر نئی چادریں بچھوائیں۔ کھانے پینے کا بھی ضروری سامان منگوا کر باورچی خانے میں لگوایا۔

اگلی صبح کو وہ پنڈی آ گئے اور سٹیشن پر آ کر اس گاڑی کا انتظار کرنے لگے جس میں نجمہ آ رہی تھی۔ گاڑی ڈیڑھ گھنٹہ لیٹ ہو گئی تھی۔ یہ وقت میر صاحب نے ریفرشمنٹ روم میں چائے پی کر گزارا۔ خدا خدا کر کے گاڑی پلیٹ فارم میں داخل ہوئی۔ میر صاحب ایک طرف ہو کر کھڑے ہو گئے۔ فسٹ کلاس ڈبے میں سے نجمہ مسکراتی ہوئی باہر نکلی۔ میر صاحب نے قریب جا کر اس کا خیر مقدم کیا۔ وہ بڑی تروتازہ دکھائی دے رہی تھی۔ اس نے ساڑھی کے اوپر فر کا کوٹ

پہن رکھا تھا جس کے بٹن کھلے تھے۔

یہاں سے ٹیکسی میں سوار ہو کر دونوں مری والی کوٹھی میں آ گئے۔ اب انہیں کسی قسم کا خوف اور کسی کا ڈر نہیں تھا۔ وہ دنیا والوں کے برے بھلے اموروں کے جنجال کو بہت پیچھے چھوڑ کر قدرت کی آغوش میں آ گئے تھے۔ نجمہ اس لئے مطمئن تھی کہ اسلم کی دھمکی کا خدشہ بہت پیچھے رہ گیا ہے اور میر صاحب اس لئے خوش تھے کہ وہ گھر والوں سے دور اب رات بھی نجمہ کے ساتھ گزار سکیں گے۔ چنانچہ یہاں بھی ایک نئی قسم کی عیاشیوں کا دروازہ کھل گیا۔ ہر روز شراب و رباب کے دور چلنے لگے۔ راتیں رنگین تر ہو گئیں۔ روپیہ پانی کی طرح خرچ کیا جانے لگا۔ ایک ٹیکسی چوبیس گھنٹے ان کی خدمت کو کوٹھی کے باہر کھڑی رہتی۔ صبح کو وہ مری چلے جاتے۔ سارا دن مری کے اعلیٰ قسم کے ہوٹلوں اور سیرگاہوں میں تفریح ہوتی۔ نجمہ ہر روز شاپنگ کرتی۔ اس نے ڈھیروں کپڑے' پرس' عطریات اور دوسری چیزیں خرید لیں۔ صرف رات کا کھانا کوٹھی پر کھایا جاتا۔ کیونکہ رات کو انہیں شراب پینی ہوتی تھی اور مری کے کسی ہوٹل میں ایسا نہیں ہو سکتا تھا۔ دن پلک جھپکنے میں گزر گئے۔ پندرہ دن چٹکیوں میں بسر ہو گئے۔ میر صاحب چلنے کے لئے تیار ہو گئے۔ نجمہ کا دل واپس جانے کو نہیں چاہتا تھا۔ اس نے خادمہ کو وہیں بلوا لیا اور میر صاحب کو بھی رخصت کر کے وہاں رہ گئی۔

دوسرے روز اس نے پرویز کو بھی بلوا لیا۔ نجمہ کے پاس کافی روپے تھے۔ اب ان دونوں کی عیاشیاں شروع ہو گئیں۔ پرویز نے نجمہ کو پھر خبردار کیا کہ کہیں وہ اتنی آگے نہ نکل جائے کہ پھر اس کے لئے میر صاحب کے چنگل سے نکلنا محال ہو جائے۔ نجمہ نے کہا۔

"میں اپنا پارٹ ادا کرنا خوب جانتی ہوں۔ تم بالکل بے فکر رہو۔"

پرویز نے شراب کا گھونٹ لے کر کہا۔

"لیکن میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ میر صاحب اتنے روپے کیسے اور کہاں سے خرچ کر رہے ہیں۔ ایک دیانت دار بنک مینیجر اتنی عیاشیاں کبھی نہیں کر سکتا۔"

نجمہ نے مسکرا کر کہا۔

"کوئی چکر چلایا ہو گا بنک میں۔"

"میرا تو خیال ہے کہ میر صاحب غبن کر رہے ہیں۔"

"سو بار کریں۔"

"لیکن نجمہ اس میں ہم بھی پھنس سکتے ہیں۔"

"وہ کیسے؟"

"اگر میر صاحب پکڑے گئے اور انہوں نے ہمارا نام لے دیا تو پولیس ہم سے بھی پوچھ گچھ ضرور کرے گی۔"

"گھبراؤ نہیں۔ ہماری سوشل حیثیت اتنی اونچی ہے کہ پولیس کو ہم پر کبھی شک نہ ہو گا۔"

"تو لاؤ۔ پھر اسی خوشی میں ایک جام اور ہو جائے۔"

اور دونوں نے جام ٹکرا دیئے۔

ایک رات اسلم نے جی میں کچھ ٹھانی اور جیب میں چاقو رکھ کر سیدھا نجمہ کی کوٹھی کی طرف روانہ ہو گیا۔ وہاں پہنچ کر اسے معلوم ہوا کہ نجمہ پہاڑی پر گئی ہوئی ہے۔ اس نے چوکیدار سے نجمہ کی کوٹھی کا پورا پتہ لیا اور اسی رات آخری گاڑی میں سوار ہو کر صبح پنڈی آ گیا۔ پنڈی آ کر اس نے شام ہونے کا انتظار کیا۔ شام کو جو آخری بس مری کو جاتی تھی، اس میں سوار ہو کر مری کی جانب چل پڑا۔

اس رات نجمہ پرویز کے ساتھ کھانا کھانے کے بعد اپنے کمرے میں ہیٹر جلا کر لحاف میں دبکی جاسوسی ناول پڑھ رہی تھی۔ پرویز دوسرے کمرے میں بیٹھا شراب کا جام پاس رکھے ریڈیو سن رہا تھا۔ اور ساتھ ہی ساتھ اونگھ بھی رہا تھا۔ سردی بہت تھی اور بڑی تیز سرد ہوا چل رہی تھی۔ اچانک کھڑکی کا پٹ کھلا اور اسلم چپکے سے اندر آ کر نجمہ کے پاس کھڑا ہو گیا۔ نجمہ نے حیران ہو کر اسے دیکھا اور سہم گئی۔ آواز اس کے حلق ہی میں رہ گئی لیکن اس نے اسلم پر اپنی گھبراہٹ ظاہر نہ ہونے دی۔ اس نے مسکرا کر پوچھا۔

"اسلم تم یہاں کیسے؟ کوئی اطلاع بھی نہ دی۔"

اسلم نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔

"میرے ساتھ چلو۔ میں اسی وقت تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔"

"نجمہ نے ذرا بلند آواز میں کہا تاکہ پرویز دوسرے کمرے میں سن لے۔"

"پاگل ہو گئے ہو اسلم! بھلا اس طرح بھی کبھی شادی ہوئی ہے۔"

"بکواس بند کرو۔"

اچانک پرویز نے یہ الفاظ سنے تو فوراً ریڈیو بند کر دیا۔ اسلم ریڈیو کی آواز بند ہونے سے چوکنا ہو گیا۔ اتنے میں پرویز بھی اندر آ گیا۔ اس نے آتے ہی گرج کر کہا۔

"کمینے! یہاں کیا لینے آئے ہو؟ نکل جا، نہیں تو ابھی پولیس کو بلواتا ہوں۔"

نجمہ بھی غصے میں آ گئی۔

"آخر تم نے مجھے سمجھ کیا رکھا ہے؟ تم دو ٹکے کیھدمی ہو اور روز ایک دھمکی دے کر چلے جاتے ہو۔ تم کیا سمجھتے ہو کہ میں تم ایسے بھکاری سے شادی کر لوں گی؟ اس خیال خام کو دل سے نکال دو -------- اور یہاں سے نکل جاؤ۔ تمہیں تو ذرا شرم نہیں آتی۔"

پرویز نے نفرت سے کہا۔

"ارے! یہ تو بے غیرت ہے بے غیرت۔ میں اس کی جگہ ہوتا تو جب تم نے گھر سے نکلوا دیا تھا تو ڈوب کر مر گیا ہوتا۔"

اسلم کے کانوں میں سیٹیاں بجنے لگیں۔ اس کی آنکھوں سے شعلے نکلنے لگے۔ اس کے کانوں کی لویں سرخ ہو کر دہکنے لگیں۔ اس نے بجلی ایسی تیزی کے ساتھ جیب سے ایک فٹ لمبا چاقو نکالا اور نجمہ پر حملہ کر دیا۔ نجمہ بھاگ کر دوسری طرف ہٹ گئی۔ بیچ میں پرویز آ گیا۔ اسلم نے پرویز پر حملہ کر دیا۔ نجمہ نے شور مچا دیا۔ پرویز نے بچنے کی کوشش کی لیکن چاقو کے تین وار اس پر ہو چکے تھے۔ دو رانوں پر، ایک کمر پر۔ وہ خون میں لت پت بے ہوش ہو کر گر پڑا۔ اس دوران میں نجمہ وہاں سے بھاگ کر دوسری کوٹھری میں پناہ لے چکی تھی۔ اسلم نے اپنے سامنے ایک لاش کو خون میں لت پت دیکھا تو ڈر گیا۔ چاقو وہیں پھینکا اور کھڑکی کے راستے باہر کود گیا۔

اس اثناء میں وہاں ارد گرد سے لوگ اندر آ گئے۔ انہوں نے فوراً پرویز کو اٹھا کر گاڑی میں ڈالا اور مری ہسپتال کی طرف اٹھ دوڑے۔ لوگوں نے اسلم کو پکڑنے کی کوشش کی مگر اسلم رات کی تاریکی سے فائدہ اٹھا کر ارد گرد کی پہاڑیوں میں غائب ہو چکا تھا۔ اسی وقت پولیس کو فون کر دیا گیا۔ ایک گھنٹے کے بعد وہاں پر پولیس آ گئی۔ انہوں نے جگہ کا معائنہ کیا۔ قاتل کے پاؤں کے نشانات کی تصویریں لیں۔ چاروں طرف پہاڑیوں میں مسلح سپاہی قاتل کی تلاش میں دوڑ پڑے۔ اسلم کوئی تین میل نیچے ایک بہت بڑی چٹان کے عقب میں سڑک سے ایک فرلانگ ہٹ کر ایک چشمے کے کنارے کوٹ میں اپنا آپ چھپائے اکڑوں بیٹھا تھا اور اندھیرے میں اس کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔

پرویز اگرچہ سخت زخمی ہوا تھا لیکن بروقت طبی امداد مل جانے سے وہ بچ گیا۔ پولیس نے اس کے اور نجمہ کے بیانات کی روشنی میں اسلم کے خلاف مقدمہ تیار کر لیا۔ اب پولیس اسلم کی تلاش میں مصروف ہو گئی۔ جب اس سانحے کی خبر میر صاحب کے کنبے کو ملی تو وہاں ایک کہرام مچ گیا۔ میر صاحب دھک سے ہو کر رہ گئے۔ انہیں ایک تو بیٹے کے اقدام قتل کا صدمہ تھا۔ دوسرے ان کے مفرور ہونے کا دکھ تھا اور تیسرے اس بات کی بھی پریشانی تھی کہ کہیں اس مقدمہ بازی میں ان کا بھید فاش نہ ہو جائے۔ اسلم کی ماں کو تو اسی وقت غش آ گیا۔ سلمہ کی آنکھوں سے خون کے آنسو جاری ہو گئے۔ بڑی مشکل سے بیگم کو ہوش میں لایا گیا۔ اس نے اپنا سر پیٹ لیا اور سارا الزام اپنے خاوند پر دھرا جس نے اپنے بچے کو گھر سے نکال دیا تھا۔

بہرحال اب تیر کمان سے نکل چکا تھا۔ پولیس ان کے گھر بھی آئی۔ پوچھ گچھ ہوئی۔ میر صاحب نے بتایا کہ انہوں نے تو ڈیڑھ مہینہ ہوا، اسے گھر سے نکال دیا تھا۔ پولیس اسلم کے دوست کو ملی۔ اس کے دفتر میں گئی۔ ہوٹل سے اس کے سامان پر قبضہ کیا اور اسے سربمہر کر کے تھانے روانہ کر دیا۔ اسلم کی تصویر اخبارات میں شائع کر دی گئی۔ اس کے الگ اشتہارات بھی چھاپ کر سارے ملک میں تقسیم کر دیئے گئے۔ ہر شہر کے تھانے کو اطلاع کر دی گئی۔ ان

سرگرمیوں کا نتیجہ یہ نکلا کہ ایک ہفتے کے بعد اسلم کراچی سے گرفتار کر لیا گیا- جب کہ وہ بصرے کے جہاز میں ایک جعلی پاسپورٹ کے ذریعے سوار ہونے کی کوشش کر رہا تھا-

اب باقاعدہ مقدمے کی سماعت شروع ہو گئی- میر صاحب بڑی ذہنی کوفت میں مبتلا ہو گئے - ایک طرف ان کا بیٹا تھا اور دوسری طرف نجمہ کی موت اور اس کی عزت کا سوال تھا- بیگم نے رو رو کر ان سے التجا کی کہ اپنے بچے کی خاطر اس مقدمے میں وکیل کیجئے اور اسے بچانے کی کوشش کریں- آخر باپ کی محبت غالب آ گئی- اور میر صاحب نے ایک وکیل تیار کر لیا- انہوں نے نجمہ سے مل کر اپنی پوزیشن صاف کر دی تھی- اور ایک دوسرے سے وعدے کر لئے تھے کہ اس مقدمے میں میر صاحب کا یا نجمہ کا بلاواسطہ کسی طرح سے بھی ذکر نہیں آئے گا- مقدمہ شروع ہو گیا- میر صاحب نے بنک سے مزید غبن کر کے اپنے بچے پر روپیہ پانی کی طرح بہانا شروع کر دیا- تیسری پیشی پر اسلم کی ضمانت ہو گئی- وہ گھر آ گیا--- مقدمے کی کاروائی جاری رہی -

پرویز اور نجمہ بالکل نہیں چاہتے تھے کہ میر صاحب کو اس مقدمے میں شکست ہو یا وہ ملوث ہوں- کیونکہ اس طرح انہی کا نقصان تھا اور مقدمے کی نوعیت بھی سنگین تھی- اس کے باوجود پرویز اور نجمہ میر صاحب کا روپیہ ہضم کرنے سے باز نہیں آ رہے تھے- گواہوں کو منحرف کروانے ' بیانات بدلوانے ' اور دوسری کئی قسم کی باتوں کے لئے میر صاحب سے آئے دن روپے لیتے اور اڑا دیتے -

چھ ماہ تک مقدمہ چلتا رہا- جس روز فیصلہ ہونے والا تھا - میر صاحب دھڑکتے دل اور تھکے ہارے جسم کے ساتھ عدالت میں کھڑے تھے- اسلم ملزموں کے کٹہرے میں کھڑا تھا- عدالت نے اسلم کو سات سال کی قید کی سزا سنا دی- میر صاحب دم بخود ہو کر رہ گئے - پولیس نے مجرم کو ہتھکڑی ڈالی اور بس میں سوار کرا کر جیل لے گئے - نجمہ اور پرویز میر صاحب کے قریب آ کر کھڑے ہو گئے- میر صاحب نے کسی سے کوئی بات نہ کی اور وہاں سے گاڑی میں بیٹھ کر سیدھا گھر آ گئے- راستے میں کئی بار ان کی آنکھوں سے آنسو نکل پڑے- انہیں اسلم کا وہ اداس چہرہ نظر آ رہا تھا جب انہوں نے اسے پولیس کے ساتھ بس میں سوار ہوتے دیکھا تھا- جب گھر میں خبر پہنچی تو بیگم بے ہوش ہو کر فرش پر گر پڑیں- سلمہ نیم جان سے ہو کر بت بنی بیٹھی رہی- دو روز تک گھر میں کچھ نہ پکا- ہر طرف ویرانی چھائی رہی- اسلم کی ماں غم سے آدھی رہ گئی- میر صاحب کے بال کنپٹیوں پر سفید ہو گئے- غم سے وہ بھی نڈھال ہو گئے- ایک ہفتہ اس ویرانی اور تباہی میں گذر گیا- دوسرے ہفتے جیل میں اسلم سے ملاقات کی- اسلم کا چہرہ اتر گیا تھا- پھر بھی اس نے ماں کو اور باپ کو حوصلہ دیا-

" اب جو ہونا تھا ہو گیا ہے- صبر اور ہمت سے کام لیجئے اور مجھے موقع دیجئے کہ میں بھی مصیبت کے دن ہمت سے کاٹ سکوں- سات سال کوئی بڑی بات نہیں - میں کوشش کروں گا کہ نیک چلنی سے اندر دن گزاروں - اس طرح کچھ سزا معاف ہو جائے گی- میں جلد باہر آ جاؤں گا- اور باہر آ کر ساری عمر آپ کی خدمت میں گزار دوں گا- انشاء اللہ پھر کبھی آپ کو مجھ سے شکایت کا موقع نہیں ملے گا- مجھے شرمندگی ہے کہ میری وجہ سے آپ کی بدنامی ہوئی اور آپ کو مصیبت کے یہ دن دیکھنے پڑے- "

وقت گزرتا چلا گیا- وقت نے غم کو کچھ کچھ ہلکا کر دیا- زخموں کو کسی حد تک مندمل کر دیا لیکن ماں کو غم نے اندر ہی اندر کھوکھلا کر دیا اور وہ مستقل طور پر بیمار رہنے لگی- تقریباً یہی حال سلمہ کا تھا مگر تقدیر اپنا وار کر چکی تھی- انہیں ہر حالت میں یہ غم اٹھانا ہی تھا-

میر صاحب نے غم غلط کرنے کے لئے نجمہ کے ہاں جا کر زیادہ پینی شروع کر دی تھی- نجمہ بھی میر صاحب کو خوب لبھانے لگی تھی- میر صاحب نے اب بنک سے بے دریغ روپیہ غبن کرنا شروع کر دیا تھا- جس طرح وہ روپیہ نکلواتے ' اسی طرح نجمہ کے ہاں جا کر اسے عیاشیوں میں لٹا دیتے- وہ آپے سے باہر ہو گئے تھے- اب انہیں برے بھلے کی تمیز نہ رہی تھی- ایک بار تو ان کے سیکرٹری نے بھی انہیں کہا کہ وہ اتنی تیزی سے روپیہ نہ نکلوائیں' کیونکہ اس میں خطرہ ہے- بہت ممکن ہے کہ راز فاش ہو جائے- پھر سنبھالنا مشکل ہو جائے گا-

" میں کچھ نہیں جانتا- میری زندگی ناکام زندگی ہے- میرا بچہ جیل میں ہے- بیوی میری سدا کی روگی ہو گئی ہے- میں اگر شراب نہ پیوں تو کیا کروں ؟ "

" لیکن حضور! یہ آپ کے خاندان کی اور آپ کی عزت کا معاملہ ہے- افریقہ والے تاجر کا پرسوں شاید خط آیا تھا- "

" کیا لکھا تھا اس نے ؟ " میر صاحب نے تیزی سے پوچھا-

سیکرٹری نے کہا-

" اس نے اپنے اکاؤنٹ کی تفصیل مانگی تھی شاید- "

" پھر کیا ہوا ؟ "

" کچھ نہیں- میں نے کاغذات تیار کر کے بھجوا دیئے تھے مگر حضور اگر آپ نے اتنی جلد بازی اور شدت سے کام لیا تو میرے لئے اس راز کو چھپا کر رکھنا مشکل ہو جائے گا- "

میر صاحب نے آہ بھر کر کہا -

" کوشش کروں گا- "

رات کو انہوں نے نجمہ سے اپنی شادی کا ذکر کر دیا- وہ بےحد اداس تھے اور بوڑھے

دکھائی دینے لگے تھے۔

" نجمہ ! اب مجھے تمہاری ضرورت ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ تم سے شادی کر کے کچھ وقت یہاں کے ہنگاموں سے دور پہاڑ پر جا کر گزار دوں۔ "

نجمہ نے کہا ۔ میں نے کب انکار کیا ہے۔ "

میر صاحب کی رگوں میں زندگی کی نئی لہر دوڑ گئی۔

" کیا تم سچ کہہ رہی ہو نجمہ ؟ "

" میں نے کبھی آپ سے جھوٹ نہیں بولا۔ میں نے ہمیشہ آپ سے محبت کی ہے اور دل کی گہرائیوں سے آپ سے بات کی ہے۔ "

میر صاحب نے نجمہ کا ہاتھ چوم لیا۔

" تو کیا تم تیار ہو ؟ "

" دل و جان سے ۔ "

" تو پھر کل ہی ہم پنڈی جا کر سول میرج کر لیتے ہیں۔ اور وہاں سے ہی ہنی مون منانے مری چلے جائیں گے۔ "

نجمہ نے اس بات کا کوئی جواب نہ دیا بلکہ اداس ہو کر سر جھکا لیا۔ میر صاحب بہت پریشان ہو گئے۔ انہوں نے بے چینی سے کہا۔

کیوں ؟ تم اداس کیوں ہو گئیں ؟ "

نجمہ کی پلکوں پر جعلی آنسو چھلک پڑے۔ اس مکار عورت کو آنسو بہانے میں بڑی مہارت تھی۔ میر صاحب بے چین ہو کر نجمہ کا منہ چوم کر بولے ۔

" خدا کے لئے مجھے بھی تو بتاؤ کہ آخر تمہیں کس چیز کا دکھ ہے۔ کون سی چیز تمہیں شادی کرنے سے روک رہی ہے۔ "

نجمہ نے بڑے دردناک انداز میں میر صاحب کی طرف دیکھا اور اور رومال سے پلکوں پر آئے ہوئے آنسو پونچھ کر بولی ۔

" زبان زیب نہیں دیتی۔ "

" تم بات تو کرو نجمہ! "

" کس منہ سے کہوں ۔ "

" خدا کے لئے میرے صبر کا امتحان نہ لو۔ میں تمہاری خاطر اپنی جان بھی قربان کرنے سے دریغ نہ کروں گا۔ "

" کہیں آپ مجھ سے نفرت تو نہیں کرنے لگیں گے ؟ "

" نجمہ مجھے اصل بات بتاؤ۔ "

جب نجمہ نے دیکھا کہ چاروں طرف سے حملے کی تیاری مکمل ہو چکی ہے۔ اور میر صاحب شکار ہونے کے لئے بالکل تیار ہیں تو اس نے آنکھیں جھکا کر کہا ۔

" بات یہ ہے کہ میں نے کسی سے شادی کا وعدہ کیا تھا اور اس سے کچھ قرض بھی لیا تھا۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب مجھے پیسوں کی سخت ضرورت تھی اور میں آپ سے نہیں ملی تھی۔ "

میر صاحب نے کہا ۔

" کون ہے وہ ؟ "

" پرویز "

" پرویز ؟ "

" ہاں پرویز ------ میں کیا کرتی مجبور تھی ۔ شادی کا وعدہ کر سکتی تھی۔ اپنی عزت نہیں بیچ سکتی تھی۔ پرویز نے مجھے اس شرط پر روپیہ دیا تھا کہ میں اس سے شادی کر لوں گا۔ اس نے کئی بار مجھ سے اپنی شرط پوری کرنے کو کہا مگر میں اس سے شادی نہیں کر سکتی اور نہ ہی روپیہ ادا کر سکتی ہوں۔ اسی لئے میں آپ سے محبت ہوتے ہوئے بھی شادی کے نام سے گھبرا جاتی تھی۔ اور آپ کو کبھی کچھ نہیں کہتی تھی ۔ "

میر صاحب بے تابی سے بولے ۔

" کتنا روپیہ دینا ہے پرویز کو ؟ "

نجمہ نے منہ ڈھیلا چھوڑ کر بڑے آرام سے کہا۔

" تیس ہزار روپیہ "

میر صاحب ایک بار تو چکرا سے گئے ۔ انہوں نے سر صوفے کی پشت سے لگا دیا۔ جیب سے سگریٹ نکال کر سلگا لیا۔ نجمہ نے فوراً نسوے بہانے شروع کر دیئے اور بولی۔

" میں آپ کو اتنی پریشانی نہیں دے سکتی۔ آپ خدا کے لئے مجھ کو میرے حال پر چھوڑ دیں۔ میری قسمت میں آپ کی محبت کی جدائی ہی لکھی ہے۔ میں کسی طرح صبر کر کے بیٹھ جاؤں گی۔ اگر قسمت میں آپ سے ملاپ نہیں لکھا تو ہم اور آپ کیا کر سکتے ہیں۔ میں آپ کے بغیر زندگی بسر کرنے کی پوری کوشش کروں گی جو کہ مجھے ناممکن دکھائی دے رہا ہے۔ اگر ایسا نہ ہو سکا تو میں خودکشی کر لوں گی۔ لیکن آپ کو مصیبتوں میں مبتلا نہیں کروں گی۔ "

نجمہ رونے لگ پڑی۔ میر صاحب نے رومال سے اس کے آنسو پونچھے۔ اسے پیار کیا اور مسکرا کر بولے۔

"میں تمہاری خاطر آسمان سے ستارے توڑ کر بھی لا سکتا ہوں - نجمہ! یہ تو صرف تیس ہزار روپے کی بات ہے- تم شادی کی تیاریاں کرو- میں کل روپیہ ساتھ لے کر آؤں گا-"

نجمہ تو حیران رہ گئی کہ یہ کیا آدمی ہے کہ بڑی آسانی سے وار پر وار سے جارہا ہے- آخر اس کے پاس قارون کا خزانہ پڑا ہے کیا ؟ میر صاحب چلے گئے تو نجمہ نے پرویز کو یہ خوشخبری سنائی- پرویز بھی حیران رہ گیا-

"نجمہ! یہ شخص یقیناً بنک میں غبن کر رہا ہے- ذرا ہوشیاری سے اس کا روپیہ خرچ کرنا - کہیں ایسا نہ ہو کہ لینے کے دینے پڑ جائیں -"

نجمہ نے ایک قہقہ لگایا -

"فکر نہ کرو- میں اپنا کام نبھانا خوب جانتی ہوں-"

چنانچہ یہی ہوا- دوسرے روز میر صاحب نجمہ کی کوٹھی میں شام کو آئے تو ان کے ہاتھ میں چمڑے کا ایک تھیلا تھا جو نوٹوں سے بھرا ہوا تھا- انہوں نے تھیلا کھول کر میز پر رکھ دیا اور روپوں کی گڈیاں نکال نکال کر میز پر ڈھیر کرنے لگے- اتنے سارے نوٹ دیکھ کر نجمہ کی آنکھوں میں چمک آگئی- چہرے پر خوشی کی لہر دوڑ گئی- میر صاحب یہ سارے نوٹ باہر رکھ کر بولے -

"یہ لو تیس ہزار روپیہ- اسے سنبھال کر رکھ لو اور اپنا قرض ادا کر دینا- اب تم آزاد ہو- مجھ سے شادی کرنے کے لئے آزاد ہو-"

نجمہ بے اختیار ہو کر میر صاحب کی آغوش میں آگئی اور ان سے لپٹ گئی اور یونہی آنسو بہانے لگی-

"ارے! تمہیں تو خوش ہونا چاہیے- بھلا! یہ کوئی رونے کا مقام ہے ؟"

نجمہ نے مصنوعی سسکیاں لیتے ہوئے کہا-

"میں نے آپ کو بہت دکھ دیا ہے- آپ نے میری خاطر کتنی بڑی قربانی دی ہے- میں اس قابل کہاں تھی- میں تو آپ کی جوتی کے برابر بھی نہیں- کاش! میں آپ کو اتنی تکلیف دینے سے پہلے مرجاتی-"

میر صاحب نے نجمہ کے ہونٹوں پر ہاتھ رکھ دیئے -

"شی- ایسی باتیں نہیں کیا کرتے- خدا کرے تمہیں میری عمر بھی لگ جائے- تم تو میرے سر کا تاج ہو میری زمین کا سورج ہو- میرے آسمان کا چاند ہو - میرے دل کی دھڑکن اور اس دھڑکن کی آواز ہو-"

نجمہ نے خوش ہو کر کہا -

"کیا آپ سچ کہہ رہے ہیں- کیا واقعی آپ مجھ سے اسی طرح پیار کرتے رہیں گے ؟"

میر صاحب نجمہ کے بالوں سے کھیلتے ہوئے بولے-

"اگر خدا نے مجھے کوئی دوسری زندگی عطا کی تو میں اس زندگی میں بھی تم سے ہی پیار کروں گا- اور دنیا میں آ کر تمہیں ہی تلاش کرتا پھروں گا اور تم سے ملے بغیر چین سے نہیں بیٹھوں گا-"

نجمہ میر صاحب سے لپٹ گئی- اس کے بعد اس نے سارے نوٹ تھیلے میں ڈالے - تھیلے کو لوہے کی الماری میں بند کر کے چابی لگائی اور میر صاحب کے پاس آ کر ان کا جی لبھانے لگی- اس نے الماری میں سے شراب کی بوتل اور گلاس نکال کر میز پر رکھ دیئے اور جام بنا کر میر صاحب کو بڑی محبت اور بڑے سلیقے سے پیش کیا- میر صاحب ایک ہی گھونٹ میں اسے پی گئے اور انہوں نے نجمہ کو اپنی آغوش میں کھینچ لیا- نجمہ ٹوٹے ہوئے پھل کی طرح میر صاحب کی جھولی میں گر پڑی اور بار بار ان کا منہ چومنے لگی اور انہیں اپنی نقلی محبت کا یقین دلانے لگی-

رات گئے تک وہ دونوں اکیلے وہاں بیٹھے شراب پیتے اور کھانا کھاتے رہے- اس کے بعد باہر بارش ہونے لگی- میر صاحب نے دوسری کوٹھی جا کر گھر فون کر دیا کہ وہ آج ضروری کام کی وجہ سے دفتر ہی رہیں گے- اور کام ختم کرنے کے بعد وہیں سو جائیں گے- اس کے بعد انہوں نے واپس آ کر نجمہ کے ساتھ مل کر مزید شراب پی- کمرہ ہیٹر سے گرم ہو رہا تھا- باہر سردی تھی اور بارش ہو رہی تھی- کمرے کی ساری کھڑکیاں بند تھیں- صرف روشندان کھلے تھے- نجمہ نے سلیپنگ گون پہن رکھا تھا میر صاحب نے بھی کپڑے بدلے اور سلیپنگ گون پہن کر نجمہ کو آغوش میں لیکر قالین پر بیٹھ گئے - شراب کی چسکیاں لینے لگے- نجمہ کو ایک بہت بڑی کامیابی ہوئی تھی- وہ اپنی کامیابی اور شراب کے نشے میں چور تھی اور میر صاحب کو ایک عیاش عورت کے اخلاقی اصول کے مطابق پورا پورا حصہ دینا چاہتی تھی- اس رات نجمہ نے میر صاحب پر ثابت کر دیا کہ وہ نجمہ سے شادی کر کے گھاٹے میں نہیں رہیں گے- یہ الگ بات ہے کہ نجمہ کسی بھی حالت میں اس ادھیڑ عمر کے آدمی سے شادی نہیں کر سکتی تھی- صبح اٹھ کر میر صاحب نے ناشتہ کیا اور شادی کا پروگرام بنانے کو بیٹھ گئے- نجمہ یوں پروگرام میں بڑھ چڑھ کر حصہ لے رہی تھی جیسے وہ وقت سے پہلے ہی شادی رچانے پر تیار ہو-

"میرا خیال ہے - اس ماہ کی گیارہ تاریخ ٹھیک رہے گی-"

"یعنی آج سے چھ روز بعد-"

" ہاں ---- دراصل نجمہ ! ان دنوں بنک میں کچھ ایسا کام ہے کہ میرا ایک دن کے لئے بھی وہاں سے غیرحاضر ہونا ناممکن ہے اور تم جانتی ہو کہ میں کم از کم ایک ماہ کی چھٹی لے کر تمہارے ساتھ مری جانا چاہتا ہوں۔"

نجمہ نے خوش ہو کر کہا۔

" ٹھیک ہے اس دوران میں میں بھی اپنے شادی کے جوڑے بنوا لوں گی۔ آخر مجھے بھی تیاری کرنی ہے ۔"

اور خود ہی جعلی انداز میں شرما گئی ۔ میر صاحب کو نجمہ کا یہ شرگیں تبسم بڑا پیارا لگا۔ انہیں یوں محسوس ہوا جیسے وہ نوجوان ہوں اور پہلی بار شادی کر رہے ہوں ۔ اس کے بعد میر صاحب بھی واپس چلے گئے ۔

ان کے جانے کے بعد نجمہ نے دروازہ اچھی طرح بند کر کے اندر جا کر الماری کھولی اور چمڑے کا تھیلا نکال کر پلنگ پر بیٹھ گئی۔ تھیلے میں سے نوٹوں کی گڈیاں اپنی جھولی میں ڈال کر انہیں خوشی سے چمکتی ہوئی آنکھوں سے دیکھنے اور بار بار گننے لگی لیکن وہ بیچ میں ہی گنتا چھوڑ دیتی اور نوٹوں کو چومنے لگتی۔ اس نے سوچا کہ وہ پرویز کو ساری رقم کا نہیں بتائے گی اور اس میں کیا حرج ہے ۔ وہ اسے بالکل ہی نہیں بتائے گی۔ میر صاحب تو پرویز سے کبھی اس رقم کا ذکر نہیں کریں گے۔

چنانچہ اس نے یہی کیا۔ پرویز سے مل کر اس سے دوسری باتیں کرتی رہی لیکن ان روپوں کا اور شادی کی تاریخ مقرر ہونے کا بالکل ذکر ہی نہیں کیا۔ کیونکہ اس کو تو میر صاحب سے شادی کرنی ہی نہیں تھی۔ کیونکہ وہ جانتی تھی کہ میر صاحب بنک سے غبن کر رہے ہیں اور ایک نہ ایک دن ضرور پکڑے ہی جائیں گے۔ اگر وہ ان کی بیوی بن گئی تو پولیس ساری رقم برآمد کر لے گی اور اس کے ہاتھ سوائے بدنامی اور رسوائی کے اور کچھ نہ آئے گا۔ اس نے فیصلہ کر رکھا تھا کہ گیارہ تاریخ کو یا اس سے دو دن پہلے وہ کراچی چلی جائے گی اور وہاں سے میر صاحب کو خط لکھ دے گی کہ اسے ایک بہت ضروری کام کے سلسلے میں اچانک کراچی جانا پڑ گیا ہے۔ وہ ایک ہفتے کے اندر اندر واپس آ جائے گی۔ اور پھر وہاں سے وہ اپنا ولایت کا پاسپورٹ بنوا لے گی اور سیدھا لندن روانہ ہو جائے گی۔

اس روز میر صاحب دفتر گئے تو سیکرٹری بڑی بے تابی سے ان کا انتظار کر رہا تھا ۔ جس وقت وہ اپنے کمرے میں پہنچے تو سیکرٹری فوراً اندر آ گیا۔ وہ کچھ گھبرایا ہوا تھا۔ میر صاحب کا کچھ ماتھا ٹھنکا۔

"کیا بات ہے ؟ تم گھبرا کیوں رہے ہو ؟"

سیکرٹری نے آہستہ سے کہا ۔

" معاملہ خراب ہو گیا ہے ۔"

" کیا بات ہوئی ہے ؟ "

میر صاحب کا بھی رنگ اڑ گیا۔ آخر عمر بھر دیانت دار اور ذمہ داری سے دفتر میں کام کیا تھا۔ اپنے گناہ کا انہیں شدت سے احساس تھا اور انہیں بھی یہ معلوم تھا کہ ایک نہ ایک روز انکا راز طشت از بام ہو کر رہے گا۔ سیکرٹری نے پریشانی کے انداز میں کہا ۔

" افریقہ والی پارٹی کا خط آیا ہے کہ اس کا سارا روپیہ نیروبی کے ایک بنک میں تبدیل کر دیا جائے۔ کل ڈائریکٹر صاحب آ رہے ہیں۔ انہیں یہاں سے چھٹی گئی ہے کہ بنک میں افریقہ والی پارٹی کا صرف بیس ہزار روپیہ ہے جب کہ اس پارٹی کے حساب کتاب کی رو سے دو لاکھ چھتیس ہزار روپے جمع ہیں۔"

میر صاحب کے ہونٹ خشک ہو گئے ۔

" لیکن یہ چٹھی ڈائریکٹر صاحب کو کس نے لکھ دی ؟ "

" خدا جانے ---- میرا تو خیال ہے کہ یہ ساری کارستانی خزانچی کی ہے ۔ اسے کسی طرح ہماری سرگرمیوں کا علم ہو گیا ہے۔ "

میر صاحب نے گردن جھکا لی ۔

" یہ تو بری بات ہوئی۔ ڈائریکٹر کب آ رہا ہے ؟"

" کل صبح ---- یہ دیکھئے ان کا تار ۔"

میر صاحب نے تار لے کر پڑھا۔ واقعی وہ دوسرے روز صبح کو لاہور پہنچ رہا تھا۔ میر صاحب کا رنگ زرد پڑ گیا ۔

" اب کچھ ہو سکتا ہے؟"

" کچھ نہیں صاحب آپ کے ساتھ میں بھی مارا جاؤں گا۔ "

"آخر تم بھی تو بیچ میں سے اپنا حصہ لیتے رہے ہو۔ "

سیکرٹری کی آواز بھرا گئی ۔

" حضور ! میں تو بال بچوں والا ہوں ۔ " میر صاحب نے کہا ۔

" تو پھر تم اس کام میں شریک ہی کیوں ہوئے تھے۔ پہلے روز ہی انکار کر دیتے۔ اب گھبرانے سے کچھ نہیں ہو سکتا۔ ظاہر ہے اب کچھ نہیں ہو سکتا۔ کسی طریقے سے بھی ہم روپیہ نہیں ڈال سکتے۔ ظاہر ہے خزانچی نے ڈائریکٹر کو سب کچھ بتا دیا ہو گا اور جعلی چیک فوراً پکڑے جائیں گے اور کل شام تک ہم حوالات میں بند ہوں گے۔ "

سیکرٹری کی گھگھی بند گئی- وہ سر پکڑ کر باہر نکل گیا -

" سنو ! "

" فرمایئے حضور ! "

" اب تم کیا کرنے کا ارادہ رکھتے ہو ؟ "

" کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا صاحب- "

" بہتر یہی ہے کہ کچھ مزید روپیہ بنک سے لے کر تم بال بچوں کو لیکر کسی دور دراز مقام پر یا کسی دور افتادہ گاؤں میں چلے جاؤ اور بھیس بدل کر کوئی چھوٹی موٹی دوکان داری شروع کر دو وگرنہ تمہاری نجات مشکل ہے -"

" حضور کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا - شاید مجھے خودکشی کرنی پڑے -"

سیکرٹری بڑبڑ کرتا ، روتا اور پریشان حال باہر نکل گیا- میر صاحب کچھ دیر تک اپنی کرسی پر بے حس و حرکت بیٹھے رہے - رنگ فق ، چہرہ پریشان ، ہونٹ خشک -

پھر فوراً کلب میں نجمہ کو فون کیا-

" ہیلو نجمہ! تم فوراً اپنی کوٹھی پہنچو - میں آدھ گھنٹے کے بعد وہاں آ رہا ہوں- تم سے ایک انتہائی ضروری کام ہے -"

" خیریت تو ہے ؟"

" بالکل خیریت ہے -"

" اچھا ! میں گھر جا رہی ہوں- "

میر صاحب نے فون بند کر دیا- دراز میں سے سیف کی چابیاں نکالیں- اٹھ کر سیف کھولی- روپوں وغیرہ کا جائزہ لیا- اس وقت سیف میں کل اکیس ہزار روپے کی رقم موجود تھی - میر صاحب نے ساری کی ساری رقم نکال کر چمڑے کے تھیلے میں ڈالی- تھیلہ بند کر کے دراز میں رکھا- کچھ دیر بیٹھ کر ادھر ادھر فائیلوں پر دستخط کرتے رہے- پھر اٹھے - چمڑے کا تھیلا ہاتھ میں لیا- اور کمرے سے باہر آ گئے- باہر نکل کر انہوں نے گردن گھما کر بنک کی عمارت پر آخری نظر ڈالی- گاڑی میں سوار ہوئے اور سیدھا نجمہ کی کوٹھی پر آ گئے- نجمہ ڈرائینگ روم میں کچھ پریشان سی بیٹھی ان کا انتظار کر رہی تھی - جب اس نے میر صاحب کا رنگ اڑا ہوا دیکھا تو فوراً سمجھ گئی کہ معاملہ خراب ہو گیاہے - میر صاحب نے تھیلا میز پر رکھ کر دروازہ بند کیا اور بولے -

" یہاں کوئی اور تو نہیں -"

" کوئی نہیں- "

" ملازمہ کہاں ہے ؟ "

" رسوئی میں- "

میر صاحب نے اطمینان کا سانس لیا- پانی کا ایک گلاس پیا اور دونوں ہاتھ پشت پر رکھے کمرے میں ادھر سے ادھر ٹہلتے ہوئے نجمہ کو غبن کا سارا واقعہ بیان کر دیا اور یہ بھی بتا دیا کہ وہ آخری بار بنک سے روپیہ نکال کر لے آئے ہیں- اور اب کبھی ادھر نہیں جائیں گے- نجمہ کو پہلے ہی معلوم تھا کہ میر صاحب کہاں سے روپیہ لاتے ہیں- لیکن اس نے میر صاحب کی زبانی سن کر حیرانی اور پریشانی کا اظہار کیا اور انہیں کہا کہ انہوں نے اس کی خاطر کیوں اتنی تکلیف برداشت کی - میر صاحب نے کہا -

" آخر میں تم سے محبت کرتا تھا- میں تمہیں کیسے پریشان یا مصیبت میں دیکھ سکتا تھا- میں تو ساری دنیا کی دولت تمہارے قدموں پر ڈھیر کرنا چاہتا ہوں- "

نجمہ نے بناوٹی پریشانی سے کہا -

" اب کیا ہو گا ؟"

میر صاحب نے سگریٹ سلگا کر کہا -

" میں چاہتا ہوں کہ ہم آج ہی مری والی کوٹھی میں چلے جائیں اور وہاں جا کر شادی کر لیں- پھر وہاں دو ایک روز رہنے کے بعد پنڈی سے سیدھے بذریعہ ہوائی جہاز کراچی چلے جائیں - میرے پاس یورپ کا پاسپورٹ ہے - تمہاری انڈورسمنٹ میں کراچی میں کروا لوں گا- وہاں سے ہم ولایت کو روانہ ہو جائیں گے - پھر ہمیں کوئی اپنی گرفت میں نہ لے سکے گا- کیا تم تیار ہو؟ میرے پاس اس وقت اکیس ہزار روپیہ موجود ہے- "

نجمہ تذبذب میں پڑ گئی- نئی رقم کی خوشخبری سن کر اس کی باچھیں کھل گئیں- اس نے میر صاحب کی گردن میں بازو حمائل کر دیئے اور بولی -

" جہاں آپ ہیں ، وہیں میرا مسکن ہے- اب تو زندگی بھر کا ساتھ ہے- اگر خوشی میں آپ کے ساتھ رہی ہوں تو غمی میں آپ کا ساتھ کیسے چھوڑ سکتی ہوں - جیسے آپ کہتے ہیں میں ویسا ہی کروں گی- آپ شام کو یہاں آ جائیے- میں آپ کا انتظار کر رہی ہوں گی- "

میر صاحب نے خوش ہو کر کہا -

" مجھے تم سے یہی امید تھی- بس اب سب ٹھیک ہو جائے گا- میں ذرا گھر جا رہا ہوں- اس وقت ساڑھے گیارہ ہوئے ہیں- میں ٹھیک پانچ بجے تمہارے پاس پہنچ جاؤں گا- تم تیار رہنا-

" بہت اچھا- "

میر صاحب نے نجمہ کو گلے لگا کر اسے پیار کیا۔ تھیلا اس کے پاس ہی چھوڑا اور گاڑی میں بیٹھ کر اپنے گھر کی طرف روانہ ہو گئے۔ پھر انہیں اچانک خیال آیا کہ آخر اس کی بیگم اور سلمہ نے کیا بگاڑا ہے کہ وہ انہیں دربدر کی ٹھوکروں کے علاوہ اور کچھ بھی نہیں دیئے جا رہے - فوراً واپس نجمہ کی کوٹھی پر آئے۔ نجمہ اس وقت تھیلے کے نوٹ گن رہی تھی - سگریٹ اس کے منہ میں تھا اور چہرے پر پیشہ ورانہ رنڈیوں جیسا تاثر تھا۔ میر صاحب کی گاڑی کی آواز سنکر فوراً سارے نوٹ تھیلے میں رکھے اور باہر جا کر پوچھا -

" خیریت تو ہے۔ آپ واپس کیوں آ گئے ؟"

میر صاحب نے کہا -

" نجمہ تم تو جانتی ہو کہ میں اب قانون کی نگاہوں میں مجرم ہوں۔ کل نہیں تو پرسوں میں مفرور قرار دے دیا جاؤں گا۔ پولیس میرے گھر میں بھی آ جائے گی۔ بنک والے میری کوٹھی اور سامان واپس لے لیں گے۔ میں چاہتا ہوں کہ یہ تھیلے والے روپے میں بیوی کو دیتا جاؤں تاکہ بعد میں وہ مصیبت کے دن کسی قدر سکون سے گزار سکے۔ "

نجمہ نے اندر سے جل بھن کر مگر بظاہر مسکرا کر کہا -

" جیسے آپ کی مرضی۔ آپ ان لوگوں کی ضرور مدد کیجئے گا۔ مجھے اس سے خوشی ہو گی۔ "

میر صاحب نے تھیلا لیا اور سیدھا گھر آ گئے۔ گھر کھانے پر انکی بیگم اور سلمہ ان کا انتظار کر رہی تھی - کیونکہ وہ پورے بارہ بجے دوپہر کو کھانا کھانے کے عادی تھے - میر صاحب نے اپنی باتوں اور بشرے سے کسی پر بھی یہ ظاہر نہ ہونے دیا کہ وہ کس قیامت خیز مصیبت میں مبتلا ہیں اور یہ کہ دو تین دنوں کے بعد اس گھر پر کیا قیامت ٹوٹنے والی ہے - ویسے انکا دل اپنے اور اپنے کنبے کے انجام پر پھٹا جا رہا تھا - کھانے کے بعد انہوں نے اپنے کمرے میں جا کر اپنی بیگم کے نام ایک رقعہ لکھا جس میں اس سے اپنے فعل کی معافی مانگی اور آخر میں اس سے التجا کی کہ وہ اس کی زیادتیوں کو معاف کر دے اور ان روپوں سے کسی چھوٹے مکان میں بیٹھ کر کچھ وقت گزار دے۔ اگر زندگی رہی تو دوبارہ ملاقات ضرور ہو گی۔ خط کے آخری جملوں پر میر صاحب کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ خط کو بند کر کے انہوں نے روپوں کے ساتھ ہی تھیلے میں بند کر دیا - تھیلا بیگم کے پلنگ کے سرہانے کے نیچے رکھ دیا اور خود سلمہ اور بیگم کے پاس آ کر ان سے آخری باتیں کرنے لگے۔ وہ پانچ بجنے کا انتظار کر رہے تھے۔ بیگم نے پوچھا کہ وہ دفتر نہیں جا رہے کیا ؟ اس پر میر صاحب نے جواب دیا کہ ان کے سر میں درد تھا اس لئے جلدی اٹھ آئے -

سلمہ نے کہا -

" میں سر دبا دوں چچا جان ؟"

" نہیں بیٹی معمولی سر درد ہے - اپنے آپ ٹھیک ہو جائے گا۔ "

میر صاحب آرام کرسی پر نیم دراز ہو گئے اور اپنی بیگم سے پرانے دنوں کی باتیں کرنے لگے - جب وہ پہلی بار دلہن بن کر ان کے گھر آئی تھی۔

ادھر نجمہ کی تمام مکار صلاحیتیں بروئے کار آ گئیں۔ اس نے میر صاحب کے جاتے ہی سب سے پہلا کام یہ کیا کہ ساتھ والی کوٹھی میں جا کر ہوائی جہاز والوں کے دفتر میں فون کیا اور اپنے لئے چار بجے والی اڑان میں کراچی کے لئے ایک سیٹ ریزرو کروا لی۔ پھر مختصر سامان ٹرنک میں رکھا۔ کچھ کپڑے اور زیورات اور سارا روپیہ ساتھ لیا - روپیہ اور زیورات ایک اٹیچی کیس میں رکھ کر اسے ہاتھ میں لیا اور سیدھا ہوائی جہاز والوں کے دفتر آ گئی - یہاں اس نے کراچی کا ٹکٹ خرید لیا اور ساتھ ہی ایک ہوٹل کے کیبن میں کھانا کھایا اور چار بجے کا انتظار کرنے لگی۔ کوٹھی میں میر صاحب کے نام ایک مختصر سا خط لکھ کر وہ ملازمہ کو دے آئی تھی - اس کا پروگرام یہ تھا کہ کراچی جا کر وہ اپنے ایک خاص دوست کے ذریعے ایک ہی دن میں پاسپورٹ بنوا لے گی اور وہاں سے سیدھا لندن روانہ ہو جائے گی۔ اور پھر کبھی واپس نہیں آئے گی۔ لندن میں کئی ایک جاننے والے اس کے موجود تھے - جب تین بج کر بیس منٹ ہوئے تو نجمہ ہوٹل کے کیبن سے باہر آ گئی - اس نے سیاہ چشمہ چڑھایا ہوا تھا۔ دفتر آ کر اس نے سامان کی چیکنگ وغیرہ کرائی۔ بڑا سوٹ کیس دفتر والوں کے حوالے کر دیا اور چھوٹا اٹیچی کیس خود ہاتھ میں تھامے جہاز کی طرف روانہ ہو گئی جو باہر میدان میں ایک طرف کھڑا تھا۔ جس وقت کسٹم پر اس کے اٹیچی کیس کو کھولا گیا تو نوٹوں کی گڈیاں لگی ہوئی دیکھ کر کسٹم والے بھی اور کچھ قطار میں کھڑے مسافر بھی حیران سے ہو کر رہ گئے - نجمہ جہاز میں آ کر نشست پر بیٹھ گئی۔ پورے چار بجے جہاز کے انجن سٹارٹ کر دیئے گئے اور تھوڑی ہی دیر بعد جہاز شہر کے اوپر سے پرواز کرتا ہوا جا رہا تھا۔ نجمہ نے سکھ کا سانس لیا۔ اپنی جھولی میں رکھے ہوئے اٹیچی پر ہاتھ پھیرا اور کرسی کی نشست سے سر لگا دیا -

پورے پانچ بجے میر صاحب نے اپنی بیگم کو الوداعی نظروں سے دیکھا اور گاڑی میں آ کر سوار ہو گئے۔ وہ بڑی تیزی سے گاڑی چلاتے سیدھے نجمہ کی کوٹھی پر پہنچ گئے۔ ان کا دل دھڑک رہا رہا اور بیوی کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے دربدر کی ٹھوکروں کے حوالے کر دینے سے ان کا دل خون کے آنسو رو رہا تھا مگر وہ کیا کر سکتے تھے - ان سے نادانی میں ایک بہت بڑی غلطی ہو گئی تھی جس کا علاج سوائے ایک اس سے بھی بڑی غلطی کرنے کے اور کچھ نہیں تھا۔ کوٹھی کے احاطے میں گاڑی کھڑی کر کے وہ باہر نکلے اور تیزی سے سیڑھیاں چڑھ کر برآمدے میں سے گذر کر کوٹھی کے ڈرائنگ روم میں آ گئے۔ یہاں انہوں نے خلاف توقع کچھ سناٹا سا محسوس ہوا۔ انہوں نے

نجمہ کو آواز دی- کہیں سے کوئی جواب نہ آیا- دوسری بار آواز دی تو خادمہ نمودار ہوئی-

" نجمہ بی بی کہاں ہیں ؟"

خادمہ نے ایک خط دراز میں سے نکال کر میر صاحب کے ہاتھ میں رکھ دیا اور خود واپس چلی گئی- میر صاحب کی کنپٹیاں بجنے لگیں- انہوں نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے لفافہ چاک کیا- اس میں سے خط نکالا اور پڑھنے لگے -

میر صاحب !

میں آپ کو اب زیادہ دیر تک اندھیرے میں نہیں رکھنا چاہتی- حقیقت یہ ہے کہ میں ایک ایسے آدمی سے شادی کر کے اپنے مستقبل کو تباہ نہیں کرنا چاہتی جو قانون کی نظروں میں مجرم ہو- اور پولیس جس کا پیچھا کر رہی ہو- امید ہے آپ مجھے معاف کر دیں گے- اس بات کا مجھے بھی دکھ ہوا ہے- اسی لئے میں یہ شہر ہمیشہ کے لئے چھوڑ کر جا رہی ہوں-

نجمہ

خط پڑھ کر میر صاحب کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے- انہیں چکر آ گیا- انہوں نے میز کا سہارا لے لیا- پاس ہی پڑے ہوئے شیشے کی صراحی میں سے پانی نکال کر پیا- خط کو ایک بار ' دوبار ' سہ بار پڑھا- ہر بار وہی تحریر تھی - وہی برچھیوں کی طرح دل و دماغ میں اتر جانے والے الفاظ تھے جو میر صاحب کا منہ چڑھا رہے تھے- تھوڑی دیر کے لئے وہ صوفے پر بیٹھ گئے- وہ سمجھ گئے کہ نجمہ ان کے ساتھ دھوکہ کر گئی ہے- وہ کبھی بھی ان کے ساتھ مخلص نہیں تھی مگر اب نجمہ کو برا بھلا کہنے سے بھی کچھ نہیں ہو سکتا تھا- پانسہ پلٹ چکا تھا- بازی ہر گئی تھی -

وہ اٹھے گاڑی میں بیٹھے اور سیدھا کنگز کلب آ گئے - یہاں پرویز سے ملے - ادھر ادھر کی باتوں کے بعد معلوم کیا کہ کیا نجمہ نے قرض کی ادائیگی کر دی ہے ؟ پرویز نے حیرانی سے پوچھا-

"کون سا قرض ؟ میں نے تو کبھی نجمہ کو قرض نہیں دیا- "

میر صاحب نے بات زیادہ کھولنے کی ضرورت ہی محسوس نہ کی- اور دیوانوں کی طرح واپس اپنے گھر آ گئے- بیگم حیران ہو رہی تھیں کہ آج ان کے میاں کو کیا ہو گیا ہے مگر اس نے پوچھنے کی جراء ت نہ کی- میر صاحب نے خود ہی بتایا کہ ایک ضروری کاغذ یہاں بھول گیا تھا- خواب گاہ میں جا کر چمڑے کے تھیلے میں سے پانچ ہزار کے نوٹ نکال کر پتلون کی جیب میں ٹھونسے اور پھر دیوانوں کی طرح اسے چلاتے نجمہ کی کوٹھی میں آ گئے- یہاں سے ڈرائنگ روم میں آ کر انہوں نے الماری کھولی- شراب کی آدھی بوتل پڑی تھی- انہوں نے میز پر بیٹھ کر شراب پینی شروع کر دی- کوئی ڈیڑھ گھنٹے میں انہوں آدھی بوتل کو نصف سے زیادہ ختم کر دیا- باقی شراب وہیں چھوڑ کر وہ سیدھا اسٹیشن پر آ گئے- یہاں ریفرشمنٹ روم میں بیٹھ کر انہوں نے کھانا کھایا -

انہیں فکر اور پریشانی کی وجہ سے زیادہ نشہ نہیں ہوا تھا- معلوم ہوا کہ کراچی جانے والی گاڑی میں ابھی ایک گھنٹہ باقی ہے- انہوں نے فون کر کے فسٹ کلاس سیٹ ریزرو کرا لی- گاڑی آئی تو اپنے ڈبے میں سوار ہو کر سیٹ پر لیٹ گئے- پھر اٹھ بیٹھے- کیونکہ ان کا سر چکرا رہا تھا- گاڑی کراچی کی طرف چل پڑی- میر صاحب نے آخری بار اسٹیشن کو دیکھا اور اپنی سیٹ پر آ کر بیٹھ گئے اور سر پیچھے لگا کر آنکھیں بند کر لیں- اس وقت ان کی آنکھوں میں آنسو چھلک رہے تھے- وہ ہمیشہ کے لئے اس شہر سے ' اپنی بیوی سے ' جیل میں پڑے ہوئے اپنے بچے سے جدا ہو رہے تھے-

---

جب رات کو میر صاحب گھر نہ آئے تو بیگم پریشان ہو گئی- اس نے صبح اٹھتے ہی دفتر میں فون کیا- معلوم ہوا کہ میر صاحب وہاں بھی نہیں تھے- بے چاری بیوہ سارا دن خاوند کا انتظار کرتی رہی- شام ہو گئی - میاں کا پھر کوئی نشان نہ ملا - اچانک سلمہ سونے والے کمرے میں گئی تو اس کی نظر بستر کے سرہانے کے نیچے رکھے ہوئے تھیلے پر پڑ گئی- اس نے تھیلا باہر کھینچ لیا- یہ میر صاحب کا بیگ تھا - اس نے تھیلا اسی طرح چچی کو لا کر دے دیا- اس خیال سے کہ میر صاحب کا تھیلا تو یہاں ہے- وہ باہر کہیں نہیں گئے- کسی دوست کے ہاں ہو سکتے ہیں-

لیکن وہ تو کبھی رات گھر سے باہر نہیں رہے- خدا خیر کرے - میری آنکھ تو کل سے پھڑک رہی تھی- تھیلا بھی یہیں رکھا ہے- "

بیگم نے جلدی سے تھیلا کھولا تو دیکھا کہ اس میں نوٹ ہی نوٹ پڑے ہیں- نوٹوں کو باہر نکالا تو ایک لفافہ بھی ساتھ ہی باہر نکل آیا جس پر بیگم کا نام لکھا تھا- کانپتے ہاتھوں سے اس نے لفافہ چاک کیا اور خط نکال کر پڑھنے لگی- سلمہ بھی اس کے ساتھ ہی پڑھنے لگی-

پیاری بیوی !

میں اس قابل نہیں رہا کہ تمہیں تمہارے مقدس نام سے مخاطب کر سکوں- میں اس شہر کو چھوڑ کر جا رہا ہوں- کہاں جا رہا ہوں ؟ یہ نہیں معلوم کیوں جا رہا ہوں ؟ اس کی وجہ بتاتے ہوئے شرم دامنگیر ہے- شاید تمہیں خود بخود اس کا علم ہو جائے گا- یہ روپیہ تمہارے اور سلمہ کے لئے ہے- اگر ہو سکے تو مجھ بدنصیب کو بھول جانے کی کوشش کرنا اور میرے گناہ مجھے معاف کر دینا- خدا بھی مجھے معاف کرے-

بدنصیب

میر عصمت اللہ

خط کا پڑھنا تھا کہ بیگم کے منہ سے بے اختیار چیخ نکل گئی- سلمہ بھی زار و قطار رونے لگی

اور ساتھ ہی اس نے اپنی چچی کے گلے میں بانہیں ڈال دیں۔ دونوں بدقسمت اور ٹھکرائی ہوئی عورتیں دیر تک روتی رہیں۔ جب ان کے دل کا غبار کچھ ہلکا ہوا تو انہوں نے ایک بار پھر خط پڑھا اور خط سمیت تھیلا میز پر رکھ دیا۔

آخر انہوں نے کیا کر دیا جو گھر چھوڑنا پڑا؟ یا اللہ! اپنی رحمت کے صدقے ہمارے گناہ بخش دے۔

دونوں چپ چاپ دری پر بیٹھ گئیں اور ناگہانی مصیبت کی راہ دیکھنے لگیں۔ وہ رات دونوں نے بغیر کچھ کھائے پیے جاگ کر گزار دی۔ صبح ملازمہ کے کہنے اور مجبور کرنے پر انہوں نے تھوڑا سا ناشتہ زہر مار کیا اور سہم کر خواب گاہ میں بیٹھیں روتی رہیں۔ بیگم اپنے خاوند اور اپنے بیٹے اسلم کو یاد کر کے آنسو بہاتی رہی اور سلمہ اس اچھے بھلے گھر کی تباہی پر گریہ کناں رہی۔

اسی روز جب بنک کے ڈائریکٹر نے آ کر حساب کتاب کی پڑتال کی تو معلوم ہوا کہ تقریباً سوا دو لاکھ کی رقم غائب ہے۔ اس نے مینجر کو بلانا چاہا۔ پتہ چلا کہ مینجر چھٹی پر ہے۔ ڈائریکٹر نے ایک بار پھر سارے حساب کی پڑتال شروع کر دی۔ دوسرا سارا دن اسی حساب کتاب اور پڑتال میں گزر گیا۔ اگلے روز پھر کام شروع کر دیا گیا۔ سارے اکاؤنٹنٹ وغیرہ اور خزانچی وغیرہ وہاں بیٹھے تھے۔ اس بار بھی وہی گھاٹا نکلا۔ خزانچی نے چیکوں پر نظر ثانی کرنے کی تجویز پیش کی۔ سیکرٹری کو بلایا گیا۔ معلوم ہوا کہ سیکرٹری بھی رخصت پر ہے۔ کئی ایک جعلی چیک پکڑے گئے۔ ڈائریکٹر نے پولیس کو بلوا لیا اور سارا معاملہ اس کے سپرد کر دیا۔

چنانچہ دوپہر کو پولیس کی موٹر میر صاحب کی کوٹھی کے باہر کھڑی ہو گئی۔ تھانیدار سپاہیوں سمیت کوٹھی کے برآمدے میں آ گیا۔ معلوم ہوا میر صاحب گھر پر نہیں ہیں۔ زنانہ پولیس کو بلوا کر سارے گھر کی تلاشی لی گئی۔ میر صاحب کا دیا ہوا روپیہ ایک جگہ سے مل گیا۔ وہ روپیہ پولیس نے ضبط کر لیا۔ بیگم اور سلمہ کا غم سے برا حال ہو رہا تھا۔ بیچاریاں سہم کر ایک طرف کھڑی تھیں اور گھر کی تباہی کا منظر اپنی آنکھوں سے دیکھ رہی تھیں۔ اگلے روز اخباروں میں میر صاحب کی تصویر اور اعلان چھپ گیا جس میں بنک والوں کی طرف سے میر صاحب کو غبن کے سلسلے میں مفرور بتایا گیا تھا۔ پولیس والوں نے شہروں میں اشتہار تقسیم کر دیئے۔ ہر شہر کے اخباروں میں تصویریں شائع کروا دیں۔ تمام متعلقہ تھانوں کو اطلاع کر دی گئی۔

بنک والوں نے میر صاحب کے گھر کا سارا سامان ضبط کر لیا۔ کوٹھی بنک والوں کی تھی۔ انہوں نے بیگم کو نوٹس دیا کہ ایک ہفتے کے اندر اندر کوٹھی خالی کر دی جائے۔ بیگم پر مصیبت کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ سلمہ نے رو رو کر آنکھیں سجا لیں۔ وہ یہاں سے نکل کر کہاں جائیں۔ ان کا تو پورے شہر میں کوئی بھی رشتے دار نہیں تھا۔ جتنے بھی رشتے دار تھے، سب بھارت میں تھے۔ جوں

جوں بے دخلی کا دن قریب آ رہا تھا، بیگم اور سلمہ کا غم کے مارے برا حال ہو رہا تھا۔ آخر وہ دن بھی آ گیا۔ جب بنک والے پولیس کے سپاہی لے کر وہاں آ گئے۔ انہوں نے تمام کمروں کو سربمہر کر دیا اور بیگم اور سلمہ کو کوٹھی سے باہر فٹ پاتھ پر پہنچا کر کوٹھی کا گیٹ بند کر کے اسی وقت تالا لگا دیا۔

اس وقت بیگم اور سلمہ فٹ پاتھ پر اکیلی بے یارومددگار کھڑی تھیں۔ ان کے پاس سوائے تین کپڑوں کے کچھ اور نہیں تھا۔ رستے بستے گھر کا کیا نقشہ پلٹ گیا تھا۔ کیسی تباہی ان لوگوں پر نازل ہو گئی تھی کہ جہاں کل تک وہ ہنسی خوشی کے دن بسر کر رہے تھے۔ اب اس گھر کے دروازے ان پر بند ہو گئے تھے۔ لوگ انہیں گھٹیا سمجھنے لگے تھے۔ کوئی وہاں نہیں آیا کسی ہمسائے نے ان کے پاس آ کر ان سے ہمدردی کے دو بول نہیں کہے تھے۔ آخر تیسری کوٹھی والوں میں سے ایک عورت نے آ کر انہیں تسلی دی اور کہا کہ مصیبتیں انسانوں پر زندگی میں آ ہی جایا کرتی ہیں۔ یہ قیامت کسی کے گھر بھی ٹوٹ سکتی ہے۔ تم بہن ہمارے ہاں چلو۔ اس میں قصور تمہارے خاوند کا ہے۔ تمہارا اور اس معصوم بچی کا نہیں ہے۔ بیگم نے بہتیرا کہا کہ ہمیں ہمارے حال پر چھوڑ دو بہن۔ تم ہماری خاطر کیوں لوگوں کے طعنے سنو۔ تم کیوں ہماری طرف سے خوامخواہ کی بدنامی مول لو۔ مگر اس انسانیت نواز عورت نے کہا۔

"دنیا کا کیا ہے بہن! یہ نہ تو تں کو دیکھ سکتی ہے اور نہ روتوں کا ساتھ دے سکتی ہے۔ یہاں تو لوگ صرف تماشہ دیکھنے کے خواہشمند ہیں اور بس! تم میرے ساتھ گھر چلو۔ میں کسی کی کیا پرواہ کرتی ہوں بھلا۔"

بیگم اور سلمہ اس عورت کے ساتھ ان کے گھر چلی گئیں۔

کراچی پہنچ کر میر صاحب نے کرنسی لینے کی کوشش میں پورا ایک دن ضائع کر دیا۔ پاسپورٹ ان کے پاس موجود تھا۔ انہوں نے لندن کے لئے تیسرے روز بعد والی سیٹ بھی بک کروا لی تھی اور ٹکٹ بھی خرید لیا تھا۔ ان کا خیال تھا کہ وہ بنک سے کرنسی حاصل کر لیں گے۔ لیکن وہ بنک مینجر کی حیثیت سے بنک نہیں جانا چاہتے تھے۔ وہ ڈرتے تھے کہ کہیں ان لوگوں کو سرکلر ایشو نہ ہو گیا ہو کہ سٹی بنک کے مینجر سے کسی قسم کا کوئی کاروبار نہ کیا جائے۔ چنانچہ انہوں نے ادھر ادھر سے کرنسی حاصل کرنے کی کوشش شروع کر دی۔ سارا دن اسی بک بک میں صرف ہو گیا۔ آخر انہوں نے بلیک میں کچھ پونڈ حاصل کر لئے۔ انہوں نے کراچی سے کپڑے وغیرہ خرید کر سوٹ کیس میں بند کئے اور پاسپورٹ اور پونڈ تھیلے میں ڈال کر ہوائی جہاز کی طرف روانہ ہو گئے۔

ابھی جہاز کی اڑان میں چار گھنٹے باقی تھے۔ وہ ایک ہوٹل میں داخل ہو گئے اور کافی منگوا

لی۔ ان کے سامنے میز پر کراچی اور لاہور کے اخبارات پڑے تھے۔ اچانک ان کی نظر اخبار کی ایک چھوٹی سی سرخی پر پڑی۔

"سٹی بنک کا منیجر لاکھوں کا غبن کر کے مفرور ہو گیا۔"

"پولیس اس کے سیکرٹری کی تلاش میں بھی ہے۔"

"ہزاروں روپے کے جعلی چیک بھی پکڑ لئے گئے۔"

میر صاحب کا تو رنگ ہوا ہو گیا۔ فوراً اخبار تہہ کر کے رکھ دیا۔ اب جو کراچی کا انگریزی اخبار اٹھایا تو اس کے اندر کے صفحے پر سٹی بنک کی طرف سے شائع کی گئی اپنی فوٹو پر نظر جا پڑی۔ نیچے لکھا تھا کہ یہ شخص جس کا نام میر عصمت اللہ ہے اور جو سٹی بنک کا منیجر تھا' لاکھوں کا غبن کر کے فرار ہو گیا ہے۔ کوئی صاحب اگر اس سے کسی قسم کا لین دین کریں گے تو بنک ذمہ دار نہ ہو گا۔

میر صاحب کو پسینہ آ گیا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ اخباروں میں ان کی تصویر بھی شائع ہو گئی ہے۔ معاملہ پولیس کے ہاتھوں میں آ گیا ہے۔ اب تو وہ باقاعدہ مجرم ہیں۔ انہیں کسی وقت بھی کہیں سے گرفتار کیا جا سکتا تھا۔ انہوں نے ہوٹل میں بیٹھے بیٹھے چاروں طرف مشتبہ نظروں سے دیکھا۔ کافی پئے بغیر ہی بل ادا کیا اور ٹیکسی میں بیٹھ کر سمندر کی جانب نکل گئے۔ وہ سوچ میں پڑ گئے کہ اب ہوائی اڈے پر کیسے جائیں۔ کیونکہ ظاہر ہے کہ ان کی تصویر ہوائی اڈے والوں کو بھی پہنچا دی گئی ہو گی۔ جب وہ لوگ اس کا پاسپورٹ چیک کریں گے تو انہیں فوراً ان کا علم ہو جائے گا اور وہ اسی وقت گرفتار کر لئے جائیں گے۔ بہرحال خطرہ اس میں بہت تھا لیکن سوائے کے اور کوئی چارہ کار بھی نہ تھا کہ یہ خطرہ مول لے لیا جائے۔

میر صاحب نے گھڑی دیکھی۔ ہوائی جہاز کے کراچی سے لندن کو روانہ ہونے میں پورا ایک گھنٹہ باقی رہ گیا تھا۔ گویا اس وقت انہیں ہوائی اڈے پر ہونا چاہئے تھا۔ میر صاحب نے خدا کا نام لیا اور سیاہ چشمہ لگا کر ٹیکسی میں بیٹھ ہوائی اڈے کی طرف روانہ ہو گئے۔ وہاں پہنچ کر انہوں نے ٹیکسی والے کو چھوڑ دیا۔ اپنا سوٹ کیس کسٹم والوں کے قلیوں کے حوالے کیا۔ خود ٹکٹ دکھلایا۔ سیٹ کا نمبر لیا اور کسٹم کروانے والے مسافروں کی قطار میں آ کر کھڑے ہو گئے۔ کسٹم والا ایک ایک کر کے چیکنگ کر رہا تھا۔ مسافروں کے سامان کو کھول کر اچھی طرح دیکھا جاتا اور پھر دستخط کر کے انہیں قلیوں کے حوالے کر دیا جاتا۔

جب میر صاحب کی باری آئی تو انہوں نے محسوس کیا کہ ذرا پرے دو سپاہی کھڑے انہیں غور سے دیکھ رہے تھے۔ میر صاحب گھبرا گئے مگر چپ چاپ وہاں کھڑے رہے۔ یوں بے فکری سے جیسے وہ تمام مسافر ہوں۔ کسٹم آفیسر نے میر صاحب کا سوٹ کیس کھول کر دیکھنا شروع کر دیا۔

اس میں ان کی ٹریولر چیک بک بھی پڑی تھی۔ بلیک والے پونڈز میر صاحب نے جوتے میں چھپا رکھے تھے۔ اب ایسا ہوا کہ کسٹم آفیسر نے میر صاحب سے پاسپورٹ طلب کیا۔ میر صاحب نے اسے پاسپورٹ تھما دیا لیکن وہ چشمے کے اندر سے ان سپاہیوں کی حرکات کا جائزہ لیتے رہے جو بار بار میر صاحب کو گھور رہے تھے اور آپس میں کچھ اشارے بھی کر رہے تھے۔ کسٹم آفیسر انکا پاسپورٹ دیکھ رہا تھا۔ اتنے میں پولیس کا ایک سپاہی میر صاحب کی طرف بڑھا اور دوسرا سپاہی پاس ہی کھڑے ایک حوالدار سے باتیں کرنے لگا۔ حوالدار سپاہی پاس ہی کھڑے ایک حوالدار سے باتیں کرنے لگا۔ حوالدار بھی سپاہی کے ساتھ میر صاحب کی طرف چل پڑا۔ ادھر کسٹم آفیسر نے غور سے میر صاحب کی تصویر دیکھی اور بولا۔

"معاف کیجئے گا۔ آپ کو کچھ دیر انتظار کرنا پڑے گا۔ آپ ادھر تشریف لے آیئے۔ دوسرا آدمی پلیز۔"

میر صاحب قطار سے باہر ہو کر ایک طرف کو چل پڑے۔ وہ سمجھ گئے تھے کہ معاملہ گڑبڑ ہو گیا ہے اور ان کا راز فاش ہو گیا ہے۔ اب وہ سپاہی ان کے قریب آ گیا تھا۔ قریب آ کر وہ رک گیا۔ اس نے میر صاحب سے پوچھا۔

"آپ کہاں جا رہے ہیں؟"

میر صاحب نے بڑی رعبدار آواز میں کہا۔

"ولایت"

"آپ کا نام؟"

میر صاحب نے اپنا غلط نام بتایا۔ اب وہاں دوسرا سپاہی اور حوالدار بھی پہنچ گئے تھے۔ انہوں نے میر صاحب کو چاروں طرف سے گھیر لیا اور حوالدار نے کہا۔

"آپ کا اصلی نام کیا ہے؟"

"بکواس بند کرو۔"

میر صاحب نے اتنا کہہ کر حوالدار کو اس زور سے دھکا دیا کہ وہ فرش پر دور جا گرا۔ اس کے ساتھ ہی انہوں نے چھلانگ لگا کر کسٹم والوں کی میز کو پھلانگا۔ دروازے پر چوکیدار کو دھکا دیکر پرے ہٹایا اور پولیس کی سیٹیوں اور لوگوں کے شور و غل میں ہال کمرے میں سے پوری قوت سے بھاگ کر دفتر سے باہر سڑک پر نکل آئے۔ باہر آ کر وہ دائیں جانب کو گھوم گئے۔ یہاں سے بغلی سڑک پر ہو گئے اور ایک گلی پار کر کے دوسری سڑک پر نکل آئے۔ اس سڑک پر آ کر انہوں نے ایک ٹیکسی کو روکا۔ اس میں جلدی سے سوار ہوئے اور "کلفٹن" کہہ کر ٹیکسی والے کو سمندر والی سڑک پر ڈال دیا۔ راستہ بھر انہیں یوں محسوس ہوتا رہا جیسے ہر کار انکا تعاقب کر

رہی ہے۔

اور تیز چلاؤ ---- اور تیز۔"

ٹیکسی ڈرائیور حیران ہو رہا تھا مگر وہ بھی انعام کے لالچ میں بھگائے لئے جا رہا تھا۔ کلفٹن پہنچ کر میر صاحب نے جیب میں سے دس روپے کا نوٹ نکال کر ٹیکسی والے کو دیا اور جلدی سے سیڑھیاں اتر کر سمندر کی طرف روانہ ہو گئے۔ سمندر کے کنارے پہنچ کر انہوں نے کنارے ہی کنارے کیماڑی کی طرف چلنا شروع کر دیا۔ راستے میں ایک جگہ پتھروں کے ڈھیر لگے تھے۔ میر صاحب کا دم پھولا ہوا تھا اور جسم تھک کر چور ہو رہا تھا۔ وہ پتھروں کی اوٹ میں بیٹھ گئے اور اپنے پاؤں بھی جوتوں میں سے نکال کر دبانے لگے۔

کتنی ہی دیر وہ وہاں بیٹھے اپنی قسمت اور گھر کی بربادی پر آنسو بہاتے رہے۔ جب شام کا اندھیرا اچھی طرح پھیل گیا تو وہاں سے اٹھے۔ سڑک پر آ کر ٹیکسی لی اور شہر کے انتہائی گنجان اور قدیم علاقے میں آ کر ایک بوسیدہ ہوٹل میں کمرہ کرائے پر لے لیا۔ کمرے میں جا کر انہوں نے کھانا کھایا اور بدبودار گندے بستر پر پڑ کر سو گئے۔ صبح منہ اندھیرے اٹھ کر انہوں نے سیفٹی ریزر سے اپنی مونچھیں مونڈ ڈالیں۔ ہوٹل میں بل ادا کر کے ایک سیلون میں آ گئے اور سر کے بال بھی منڈوا ڈالے۔ شلوار اور قمیض بازار سے خریدی۔ اسے پہنا۔ سر پر سندھی فیشن کی ٹوپی رکھی اور بالکل ہی انوکھے حلیے میں سٹیشن کی جانب روانہ ہو گئے۔ اس سے پہلے انہوں نے اپنے پونڈز پھر سے بلیک میں فروخت کر کے پاکستانی کرنسی حاصل کر لی تھی اور چھ سو روپے کے نوٹوں کو شلوار کے نیفے میں چھپا لیا تھا۔ سٹیشن پر آ کر انہوں نے راولپنڈی کا تھرڈ کلاس کا ایک ٹکٹ خریدا اور گاڑی میں سوار ہو گئے۔ جب تک گاڑی کھڑی رہی میر صاحب اپنے اس نئے حلیے میں برتھ پر لیٹے رہے اور بیڑی پیتے رہے۔ جب گاڑی روانہ ہوئی تو نیچے آ کر بیٹھ گئے۔ سارا راستہ وہ یہی کرتے رہے۔ جب ٹرین لاہور آ کر رکی تو میر صاحب کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

گاڑی رات کے دو بجے راولپنڈی کے سٹیشن پر پہنچی۔ میر صاحب پلیٹ فارم پر اتر پڑے۔ ان کے پاس کسی قسم کا کوئی سامان نہیں تھا۔ وہ بالکل خالی ہاتھ تھے۔ صرف ایک میلی سی چادر کندھے پر ڈال رکھی تھی۔ اگرچہ گرمیوں کا موسم تھا لیکن رات بڑی خوشگوار تھی۔ میر صاحب کو بے حد نیند آ رہی تھی۔ وہ ایک خالی بینچ پر چادر اوڑھ کر لیٹ گئے اور لیٹتے ہی انہیں نیند آ گئی جس وقت ان کی آنکھ کھلی تو دن نکل آیا تھا۔ اور دھوپ ریلوے لائنوں پر چمک رہی تھی۔ میر صاحب نے اٹھ کر نلکے پر منہ ہاتھ دھویا۔ سٹال پر کھڑے ہو کر چائے اور ڈبل روٹی کا ناشتہ کیا اور سٹیشن سے باہر آ گئے۔ یہاں سے وہ سیدھا ایک ہوٹل میں آ گئے۔ وہ قصداً کسی بھی عزیز سے عزیز دوست کے ہاں نہیں جانا چاہتے تھے۔ انہیں معلوم تھا کہ کسی بھی دوست کے ہاں جا کر

وہ اپنا آپ زیادہ دیر تک نہ چھپا سکیں گے۔ اس کے علاوہ وہ صرف اپنی وجہ سے کسی بھی دوست کو مصیبت میں ڈالنا نہیں چاہتے تھے۔ ہوٹل میں جا کر انہوں نے پھر چائے پی۔ کمرے کو تالا لگایا اور بازار میں آ کر ایک شلوار اور قمیض خرید لی۔ اس کے ساتھ ہی انہوں نے سندھی ٹوپی اتار دی اور اس کی جگہ انہوں نے سر پر یارقندی سٹائل کی سی اوندھی ٹوپی سر پر مڑھ لی۔ رات پنڈی کے اس بوسیدہ ہوٹل میں بسر کرنے کے بعد صبح منہ اندھیرے میر صاحب نے کوہ مری جانے والی بس پکڑ لی۔ راستے میں جب ان کی خریدی ہوئی کوٹھی آئی تو میر صاحب کے دل سے ایک ہوک سی نکل گئی اس کوٹھی کو بھی بنک والوں نے اپنے قبضے میں لیکر اس پر تالا ڈال رکھا تھا۔

کبھی اس کوٹھی میں وہ شہزادہ بن کر نجمہ کے ساتھ داد عیش دیا کرتے تھے لیکن آج اسی کوٹھی کے سامنے سے ایک بے یار و مددگار فقیر کی حیثیت سے گذر رہے تھے۔ قدرت کے قوانین کسقدر سخت ہوتے ہیں اور خدا کی گرفت کتنی مضبوط اور حیران کن ہوتی ہے۔ کوہ مری پہنچ کر انہوں نے ایک درزی کی دوکان میں شب باشی کی۔ اپنا نام میر علی ظاہر کیا اور بتایا کہ میں پٹواری ہوں اور آزاد کشمیر جا رہا ہوں۔

میر پور کچھ روز رہنے کے بعد وہاں میر صاحب کا جی نہ لگا۔ وہ وہاں سے پھر مری آ گئے۔ یہاں سے نتھیا گلی اور پھر ایبٹ آباد آ گئے۔ ایبٹ آباد اور حویلیاں کے درمیان کوئی آٹھویں میل پر وہ اتر گئے اور یوں ہی ایک طرف کو ڈھلوان پر چلنا شروع کر دیا۔ کوئی تین چار میل پیدل ہی چلنے کے بعد انہیں کچھ کچے مکانات ملے جو پہاڑی کی ڈھلوان پر بنے تھے ان مکانوں کی چھتوں پر مکئی کے بھٹے سکھانے کو پڑے تھے۔ ایک مکان کے کچے آنگن میں کچھ بچے آنکھ مچولی کھیل رہے تھے۔ دھوپ میں ایک بکری سبز سبز گھاس پر کلیلیں کر رہی تھی۔ میر صاحب کو یہ منظر بے حد خوبصورت اور معصوم لگا۔ انہوں نے وہیں رہنے کا فیصلہ کر لیا اور ایک مکان کے باہر دستک دی۔ ایک نوجوان لڑکا باہر آیا۔ میر صاحب نے اس کے باپ کا پوچھا۔ جب وہ باہر نکلا تو میر صاحب نے سلام کیا اور اس آدمی کو ساتھ لیکر گھاس پر بیٹھ گئے۔ اسے یونہی اپنی ایک من گھڑت رام کہانی سنائی اور آخر میں کہا کہ دنیا میں ان کا کوئی نہیں رہا۔ وہ بالکل اکیلے ہیں اور بچوں کو پڑھا کر وہاں زندگی بسر کرنا چاہتے ہیں۔

بوڑھے کسان نے کہا۔

"جیسے آپ کی خوشی! ہم ہر طرح سے خدمت کو ضرور حاضر ہیں۔"

میر صاحب کو اس آدمی نے گاؤں کے دوسرے لوگوں سے ملوایا۔ انہوں نے ایک کوٹھری اور بستر میر صاحب کو دے دیا۔ میر صاحب نے ان لوگوں کے بچوں کو پڑھانا شروع کر دیا اور ساتھ ہی ساتھ شیو کروانی بند کر دی۔ وہ چاہتے تھے کہ ان کے داڑھی مونچھیں آ جائیں اور

مولوی نما آدمی بن جائیں تاکہ انہیں اس حلیے میں پہچاننا بالکل ہی مشکل ہو جائے۔

کراچی پہنچ کر نجمہ کو پتہ چلا کہ جس آدمی سے وہ پاسپورٹ بنوانا چاہتی تھی' وہ تبدیل ہو کر باہر کسی سفارت خانے میں چلا گیا ہے۔ نجمہ کراچی کے ایک بہت بڑے ہوٹل میں اتری تھی۔ ایک ہفتہ کی تگ و دو کے بعد وہ پاسپوٹ بنوانے میں کامیاب ہو گئی۔ اس دوران میں وہاں اس کے دو ایک نئے دوست بھی بن گئے جن میں سے ایک مسٹر قاسم نے اپنے چمڑے کا بہت بڑا بیوپاری اور کروڑ پتی ظاہر کیا اور دو ہی دن میں نجمہ پر کوئی ڈیڑھ دو ہزار روپے خرچ کر دیئے۔ قاسم نے وعدہ کر لیا تھا کہ وہ بھی نجمہ کے ساتھ یورپ جائے گا اور اسے خود وہاں سیر کروائے گا۔ صبح نجمہ اور قاسم کو سیٹ بک کروانے جانا تھا۔ رات دونوں نے اکٹھے بسر کی۔ رات گئے تک وہ شراب پیتے اور ہوٹل کی چھت پر ڈانس وغیرہ دیکھتے رہے۔ پھر اپنے کمرے میں آ کر لیٹ گئے۔ نجمہ شراب کے نشے میں چور تھی اور قاسم نے اسے مزید تھوڑی سی شراب پلا دی۔ نجمہ بالکل وحت ہو کر بے سدھ ہو کر پلنگ پر پڑ گئی۔

صبح ہوئی تو نجمہ کی آنکھ کھلی۔ اس نے دیکھا کہ کھڑکی کے پردے ہوا میں لہرا رہے تھے اور کمرے میں سنہری دھوپ پھیلی ہوئی تھی۔ اس کے بعد اس نے دیکھا کہ وہ بالکل عریاں حالت میں لیٹی ہوئی ہے۔ وہ حیران سی ہو گئی۔ اس نے جلدی سے اٹھ کر کپڑے پہنے۔ دوسرے پلنگ پر نظر ڈالی تو وہاں اس کا ساتھی یعنی کروڑ پتی قاسم نہیں تھا۔ اس نے جلدی سے الماری کھولی۔ اس کی ساری نقدی' زیورات اور ریشمی کپڑے بھی غائب تھے۔ نجمہ کا سر چکرا گیا اور وہ جلدی سے پلنگ پر بیٹھ گئی۔ کروڑ پتی قاسم اسے ٹھگ گیا تھا اور سبز باغ دکھا کر لوٹ کر لے گیا تھا۔ اس نے پولیس کو فون کرنا چاہا مگر پھر یہ سوچ کر رک گئی کہ پولیس اس کو کہیں دوسرے کیس میں نہ دھر لے اور پھر اسے میر صاحب والے کیس میں بھی ملوث ہونے کا ڈر تھا۔ چارو ناچار روپیٹ کر رہ گئی۔ پرس کھول کر دیکھا اس میں صرف بارہ روپے تین آنے کی نقدی رہ گئی تھی۔ نجمہ کا کل یہی اثاثہ تھا۔ سارا دن اس نے اپنے کمرے میں رہ کر اپنی قسمت پر آٹھ آٹھ آنسو بہاتے گزار دیا۔ شام کو وہ میک اپ کر کے ہوٹل کی چھت پر آئی۔ رات گئے تک اس نے ایک شکار پھانس لیا۔ لیکن اسے صدمہ بھی بہت تھا کہ وہ مہارانی بن کر یہاں سے یورپ کا عزم لے کر نکلی تھی اور اب فقیرنی بن کر داخل ہو رہی ہے۔ اس نے پرویز کو سب کچھ بتا دیا اور کلب میں جا کر سارا دن شراب پیتی اور میر صاحب کو کوستی اور نقلی کروڑ پتی قاسم کو گالیاں بکتی رہی۔ ایک دوبار پولیس والے اس کے پاس تفتیش کے سلسلے میں آئے لیکن اس نے بھی صاف صاف بتا دیا کہ میر صاحب کبھی کبھی کلب میں آیا کرتے تھے اور جس طرح وہ دوسرے لوگوں سے ملتی ہے' اسی طرح ان سے بھی کبھی کبھی بات چیت کر لیا کرتی تھی۔ اس سے زیادہ اس کے میر صاحب

سے کوئی تعلقات نہ تھے۔ پولیس واپس چلی گئی اور پھر کوئی شخص اس سے میر صاحب کے بارے میں کچھ دریافت کرنے نہ آیا۔ نجمہ نے پھر سے کنگز کلب میل اپنی ریاکارانہ زندگی کا آغاز کر دیا۔

جیل میں اسلم کی قید کا دوسرا سال گزرنے والا تھا۔ شروع شروع میں اسے بھی دوسرے قیدیوں کے ساتھ مشقت دی گئی مگر بعد ازاں اس بناء پر کہ وہ پڑھا لکھا ہے نوجوان ہے جیلر نے اسے دوسرے قیدیوں کی گنتی وغیرہ اور انکا حساب کتاب رکھنے پر لگا دیا۔ اسلم کے لئے یہ ایک بالکل ہی نیا اور تکلیف دہ تجربہ تھا۔ وہ کبھی زندگی بھر ایک جگہ قید نہیں ہوا تھا۔ مشقت کرتے کرتے اس کے ہاتھوں میں چھالے پڑ گئے۔ جسم پر مچھروں اور کھٹملوں نے کاٹ کاٹ کر ادھیڑ ڈالا۔ چہرہ چھائیوں سے بھر گیا۔ آنکھوں کے گرد حلقے پھیل گئے۔ کچھ عرصہ بعد جب اسے لکھنے کا کام دیا گیا تو اسے کچھ سہولت ہو گئی پھر بھی گھٹیا خوراک اور ایک جگہ بند رہنے اور جرم پسند لوگوں کے درمیان رہنے سے اسلم کی ذہنی حالت کو شدید نقصان پہنچا۔ دوسال کے اندر اندر یہ ذہنی اضطراب اور روحانی کوفت بھی کم ہو گئی۔ اب وہ قیدی جن سے وہ نفرت کرتا تھا۔ اس کے دوست تھے اور وہ ان سے ہنس ہنس کر مذاق بھی کر لیا کرتا تھا۔

ان قیدیوں کی ذہنیت بالکل یکساں تھی۔ ہر قیدی اپنے آپ کو بے گناہ کہتا تھا اور الزام اس پارٹی کے سر تھوپتا تھا جس کے افراد رہا ہو گئے تھے۔

"اجی! انہوں نے روپیہ چڑھا دیا اور بچ گئے۔ ہمارا سوائے خدا کے اور کوئی نہیں تھا' اس لئے پھنس گئے۔"

دوسرا بولا۔

"یہ نہ کہو۔ اگر تم بے گناہ ہوتے تو خدا تمہاری ضرور مدد کرتا۔ تم نے اس سے پہلے کوئی جرم ضرور کیا ہو گا۔ جس میں تم بچ گئے ہو گے۔ اب جرم کی سزا تمہیں اس دفعہ مل رہی ہے۔ سمجھے خدا کے ہاں دیر ہے اندھیر نہیں۔ وہ انصاف ضرور کرتا ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ اس کے انصاف میں دیر ہو جائے۔"

اسلم کو شروع شروع میں ان کی باتیں بڑی احمقانہ اور بے معنی معلوم ہوتی تھیں۔ مگر جوں جوں وقت گزرتا گیا۔ اس پر انکشاف ہوا کہ قیدی نہ اچھا ہوتا ہے نہ برا۔ نہ عقلمند ہوتا ہے نہ احمق۔ وہ صرف قیدی ہوتا ہے اور اس کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا۔ وہ ایک طرح ہی سوچتا اور ایک طرح ہی عمل کرتا ہے۔ وہ خود کو بے گناہ تصور کرتا ہے اور جیل سے رہا ہونے

کے بعد پھر سے جیل میں آنے کی ترکیبیں سوچتا رہتا ہے۔

اسلم نے بھی ان لوگوں کو اپنی بے گناہی کی کہانی سنا دی - انہوں نے اسلم کی داستان پر اسی طرح یقین کر لیا جس طرح وہ چاہتے تھے کہ ان کی کہانیوں پر بھی ایمان لے آیا جائے۔ اسلم کو سب سے زیادہ فکر اپنے ماں باپ کا تھا۔ وہ جب سے جیل میں آیا تھا۔ ان سے صرف دوبار ملاقات ہو سکی تھی۔ اُس کے بعد کوئی بھی اس سے ملنے جیل نہیں آیا تھا۔ اس نے گھر کئی ایک خط لکھے مگر اسے کسی خط کا جواب نہ آیا۔ تنگ آ کر اس نے بنک والوں کے نام ایک خط لکھا۔ اس کا بھی کوئی جواب نہ آیا - صرف جیل کے حکام کی طرف سے اسے یہ بتایا گیا کہ اس کا باپ بنک سے غبن کر کے بھاگ گیا ہے اور پولیس اس کی تلاش میں ہے۔ ماں اور سلمہ پر کیا گزری؟ اس کے بارے میں اسلم کو کوئی علم نہیں تھا۔ دوسرا سال بھی ختم ہونے کو آ گیا مگر اسلم کو اپنی ماں ' باپ اور سلمہ کے متعلق کچھ پتہ نہ چل سکا۔ وہ تھک ہار کر ناامید ہو کر بیٹھ گیا اور یہ سوچ کر اس نے صبر کر لیا کہ اگر زندگی میں ملاقات لکھی ہوئی تو کبھی مل ہی لیں گے۔ اس کے سوا وہ کر بھی کیا سکتا تھا۔

حقیقت یہ تھی کہ سلمہ اور اسلم کی ماں اپنی زندگی کے دن بڑی بری حالت میں بسر کر رہی تھیں۔ ہمسایوں کے ہاں ایک ماہ یونہی پڑے رہنے کے بعد ان لوگوں نے بھی بیگم کو میر صاحب کے طعنے دینے شروع کر دیئے - بات بات پر انہیں ٹوکا جانے لگا۔ ان دونوں کی زندگی ضیق میں آ گئی۔ آخر انہوں نے وہاں سے چلے جانے کا فیصلہ کر لیا۔ لیکن سوال یہ تھا کہ کہاں اور کس طرف جایا جائے۔ بوڑھی عورت اور ایک ساتھ جوان لڑکی! کیا دنیا والے اسے عزت و آبرو کے ساتھ زندہ رہنے دیں گے؟

وہ دونوں کوٹھی کے گیراج میں رات کو سوتی تھیں اور روکھا سوکھا انہیں دے دیا جاتا تھا۔ اس پر ستم یہ ہوا کہ وہاں ایک منہ چڑھا نوجوان تھا جس نے سلمہ پر ڈورے ڈالنے شروع کر دیئے -

بیگم نے ایک رات سلمہ سے کہا -

" بیٹی! اب یہاں سے کوچ کر جانا ہی بہتر ہے۔ یہاں عزت و آبرو محفوظ نہیں ہے - ہم کسی دوسری جگہ محنت و مزدوری کر لیں گی۔ مگر اب یہاں نہیں رہیں گی۔ "

سلمہ نے کہا -

" ٹھیک ہے ماں جی! ہمیں یہاں سے چل ہی دینا چاہئے - "

" لیکن بیٹی جائیں گے کہاں؟ ہمارے پاس تو سوائے چند روپوں کے اور کچھ نہیں ہے اور پھر تم بھی معمولی پڑھی لکھی ہو - کوئی کام بھی کرنا نہیں جانتیں۔ ناز و نعم میں پلی ہو۔ کیسے گزر بسر ہو گی؟"

سلمہ نے کہا -

" ماں جی! میں کسی کے گھر جا کر ان کے برتن بھانڈے مانجھ دیا کروں گی مگر یہاں رہ کر آپ کو ذلیل نہیں ہونے دوں گی - یہ لوگ کتنی ہمدردی سے ہمیں یہاں لائے تھے اور اب ہماری صورت سے بھی بیزار ہو رہے ہیں۔ "

بیگم نے آہ بھر کر کہا -

" ٹھیک ہے بیٹی! یہی دنیا والوں کی ریت ہے۔ جب اپنوں ہی نے منہ پھیر لیا تو بیگانوں سے کیا گلہ؟ اس میں ان لوگوں کا کوئی دوش نہیں ہے۔ بہتر یہی ہے کہ ہم ہی یہاں سے چلے جائیں۔ "

سلمہ نے کہا -

" آپ فکر نہ کریں۔ یہاں میری ایک سہیلی رہتی ہے۔ ہم کچھ دنوں کے لئے ان کے ہاں چلیں گے۔ پھر وہاں سے کوئی دوسرا قدم اٹھائیں گے۔ "

" بیٹی! بدنام لوگوں کے کوئی کام نہیں آیا کرتا - مصیبت زدوں سے سب کنی کتراتے ہیں۔ اپنی سہیلی کے لئے پریشانیاں پیدا نہ کرو - "

" ہم ان کے ہاں زیادہ نہیں ٹھہریں گے - وہاں چل کر آپ آرام کریں اور میں نوکری تلاش کرنے کی کوشش کروں گی۔ کہیں نہ کہیں تو کام مل جائے گا -"

" جیسی تمہاری مرضی بیٹی! "

چنانچہ دوسرے روز سلمہ اور بیگم اس کوٹھی والوں سے اجازت لیکر ان کی ہمدردیوں اور مہمان نوازی کا شکریہ ادا کر کے چل دیں۔ سلمہ کی سہیلی کو ان کے گھر کی تباہی کی ساری خبر مل چکی تھی۔ اس نے روتے ہوئے سلمہ اور بیگم کا خیر مقدم کیا اور کہا -

" یہ آپ کا گھر ہے بہن! جب تک جی چاہے رہو۔ آپ لوگوں کی مصیبتوں کو دیکھ کر کلیجہ پھٹا جاتا ہے۔ "

اب دونوں کو ایک کمرہ دے دیا گیا - جہاں انہوں نے رہنا شروع کر دیا۔ بیگم نے سلمہ سے کہہ دیا کہ اس سے پیشتر یہ لوگ بھی انہیں کوسنے اور طعنے دینے شروع کر دیں۔ نوکری کی جلد از جلد کوشش کی جائے - سلمہ بے چاری برقعہ اوڑھ کر روز صبح گھر سے نوکری کی تلاش میں نکل جاتی اور دوپہر کو گھر آتی۔ اس کے اس طرح اکیلے گھر سے چلے جانے پر اس کی سہیلی کے ماں باپ نے اعتراض کرنا شروع کر دیا۔ ٹھیک ہے - کسی بھی شریف گھرانے میں یہ بات گوارا نہیں کی جاتی کہ وہاں سے ایک نوجوان برقعہ پوش لڑکی نوکری کی

تلاش میں صبح سویرے تن تنہا نکلے اور دوپہر کو گھر آ جائے۔ اب کسی کو کیا خبر کہ وہ کہاں جاتی ہے اور کس سے مل کر آتی ہے۔

لیکن سلمہ نے کسی کی بات پر کان نہ دھرا ۔اس نے نوکری کی تلاش کے سلسلے میں اپنی سرگرمیاں جاری رکھیں۔ محلے والوں نے اسے روز آتا جاتا دیکھ کر اس پر نظر رکھنی شروع کر دی۔ محلے کے دو ایک لونڈوں نے اس کا تعاقب بھی شروع کر دیا۔ بسوں میں اور پیدل چلتے ہوئے کئی آوارہ لڑکے اس سے بات کرنے کی کوشش کرتے۔ اسے آوارہ لڑکی سمجھ کر اس کا پیچھا کرتے ۔ اس پر آوازے کستے ۔ مگر سلمہ ان تمام باتوں سے بے نیاز گھر کی مصیبتوں کا بوجھ اٹھائے اپنے کام میں مگن رہی۔ آخر اسے ایک جگہ بچوں کی دیکھ بھال یعنی آیا گیری کی نوکری مل گئی۔

یہ ایک ٹھیکیدار کا بہت بڑا مکان تھا جو شہر کے اندر واقع تھا ۔ اس گھر میں ہر طرف سڑے بسے چہرے بھرے ہوئے تھے۔ بچے ضدی ' اکھل کھڑے اور انتہائی بدتمیز تھے ۔ ٹھیکیدار کی شکل بڑی خوفناک تھی۔ وہ ایک ہی بھینسا تھا۔ آنکھیں سرخ ' پاؤں کے تلوے پاٹ ' ایک کان ٹیڑھا ہو کر پرانے زمانے کا سموسہ بن گیا تھا۔ تنگ موری اور چھوٹے گھیرے کی شلوار اور بغیر کالر کے قمیض پہنتا اور سر پر قراقلی کی ٹوپی اوڑھے رکھتا تھا۔ وہ دونوں ہاتھ ہمیشہ پشت پر باندھے بھاگڑ بلوں کی طرح گھر میں داخل ہوتا اور چاروں طرف بو سونگھتا پھرتا ------ ٹھیکیدارنی اس سے بہت ڈرتی تھی۔ وہ صحن میں کھڑے ہو کر زمین پر بار بار تھوکا کرتا ۔ بچے اسے دیکھ کر ڈر کر سلمہ کے پاس بھاگ جایا کرتے۔

بچے سلمہ سے بڑا پیار کرتے تھے۔ سلمہ کو بھی ان سے انس ہو گیا تھا۔ سلمہ اور بیگم دونوں اس حویلی نما مکان کے ایک نچلے کمرے میں رہا کرتی تھیں۔ دونوں کو کھانا وہیں سے ملتا تھا۔ اس کے علاوہ سلمہ کو تین روپے ماہوار تنخواہ بھی مل جاتی تھی۔ سلمہ ان بچوں کو اردو کی پہلی کتاب پڑھایا کرتی تھی۔ بیگم انہیں قرآن شریف پڑھایا کرتی تھیں۔ اس گھر میں دن بھر ہی ملنے والے رشتے دار اور عورتوں کا تانتا بندھا رہتا تھا۔ اس لئے کبھی کبھی سلمہ کو ان لوگوں کے لئے چائے کا ٹرے یا شربت کے گلاس لے کر اندر جانا پڑ جایا کرتا تھا۔ کیونکہ وہاں بھی سوائے ایک نوکرانی کے اور کوئی ملازم نہیں تھا۔ اس نوکرانی کو سارا دن برتن بھانڈوں کا انبار دھونے سے ہی فرصت نہیں ملتی تھی ۔

ٹھیکیدارنی اگرچہ بڑی نیک عورت تھی لیکن اس میں ایک خرابی تھی ۔ وہ لڑائی بہت جلد کر لیا کرتی ۔ دیکھتے دیکھتے اس کے مزاج کا پارہ چڑھ جاتا اور وہ کوئی نہ کوئی چیز اٹھا کر دے مارتی ۔ ایک بار سلمہ کے ہاتھ سے شیشے کا جگ گر کر ٹوٹ گیا۔ ٹھیکیدارنی کا پارہ تیز ہو گیا۔ اس نے

ایک تھپڑ اس کے رسید کر دیا ۔ سلمہ کے آنسو نکل آئے۔ اس نے اس کا ذکر بیگم سے بالکل نہ کیا۔ شام کو ٹھیکدارنی نے اسے پاس بلا کر پیار کیا اور کہا ۔

" میں کیا کروں ۔ میری طبعیت ہی ایسی ہے کہ ذرا سا غصہ بھی برداشت نہیں ہوتا ۔ تم خود ہی چیزوں کا خیال رکھا کرو ۔ آخر تو سیانی ہو ۔ میں تو اب بوڑھی ہو گئی ہوں۔ "

ٹھیکلیدارنی کا ایک بھانجا رشید نامی نوجوان تھا جو شہر میں کسی جگہ کپڑے کی دوکان کرتا تھا ۔ یہ بڑا شرابی اور عیاش آدمی تھا اور گاہے گاہے اپنی خالہ کے گھر آیا کرتا تھا۔ جس روز سے اس نے سلمہ کے حسن و شباب کا جائزہ لیا تھا ۔ وہ تقریباً ہر دوسرے روز وہاں آنے لگا تھا۔ سلمہ کو وہ ایک آنکھ نہ بھاتا تھا۔ ویسے بھی سلمہ ایک شریف النفس لڑکی تھی اور اسے دنیا کی برائیوں کی کوئی خبر نہ تھی ۔ لیکن رشید عیاش اور جہاندیدہ نوجوان تھا ۔ اس نے سلمہ پر ڈورے ڈالنے شروع کر دیئے ۔ آخر وہ اس کی خالہ کی ملازمہ تھی۔ اسے اس اعتبار سے بھی سلمہ کو چھیڑنے کا پورا پورا حق حاصل تھا۔ وہ آتے جاتے سلمہ کو مذاق کیا کرتا۔ اور کبھی آنکھیں گھما گھما کر مسکرانے لگتا ۔ سلمہ اس کے ہاتھوں بڑی تنگ آ گئی مگر مصیبت کی ماری مجبور تھی ۔ وہ اپنا اور بیگم کا پیٹ پال رہی تھی بلکہ دربدری اور خاک بسری کے دن پورے کر رہی تھی۔ گردش آفاق نے انہیں روٹی کے ٹکروں کا محتاج کر دیا تھا اور ان کی عزت و آبرو کو خطرے میں لا ڈالا تھا ۔ وہ رشید کی کسی بات کا کبھی کوئی جواب نہ دیتی تھی ۔

مگر رشید کی سرگرمیاں اب حد سے بڑھ گئیں تھیں۔ ایک روز شام کو بچوں کو سلانے اور ٹھیکیدارنی کو کھانا کھلانے کہ بعد سلمہ اپنی کوٹھری کی طرف جا رہی تھی کہ رشید اسے سیڑھیوں میں مل گیا۔ سلمہ اوپر واپس جانے لگی تو رشید نے آگے بڑھ کر اس کی کلائی پکڑ لی ۔

" میری جان ! آخر ہم نے کیا قصور کیا ہے جو تم اس طرح ہم سے کتراتی ہو ؟ کیا ہم تمہارے لائق نہیں ؟ تم جو مانگو ' ہم حاضر کرنے کو تیار ہیں ۔ ایمان سے وہ عیش کروائیں گے کہ نوکری کرنے کی ضرورت نہ رہے گی ۔"

سلمہ ایسی شریف 'کم گو اور باحیاء لڑکی جس کی کلائی پر آج تک کسی نامحرم کا ہاتھ نہ پڑا تھا ۔ اس قسم کی فحش باتوں کا کیا جواب دے سکتی تھی ۔ وہ گم صم سی ہو کر کھڑی رہی۔ رشید نے سمجھا کہ سلمہ راضی بر رضا ہے ۔ اس نے سلمہ کو اپنی طرف کھینچنا چاہا تو سلمہ نے زور سے اس کا ہاتھ جھٹک دیا اور بولی ۔

" مجھے چھوڑ دو ۔ چھوڑ دو مجھے ۔ "

رشید کسی طرح کلائی نہ چھوڑ رہا تھا ۔ سلمہ زور آزمائی کر رہی تھی اور رشید بڑے مکروہ انداز میں مسکرائے جا رہا تھا۔

"خدا کے لئے مجھے جانے دو - میں ایسی عورت نہیں ہوں جیسی تم سمجھ رہے ہو -"

رشید ہنس کر بولا -

"سب یہی کہا کرتی ہیں اور سب عورتیں ایسی ہی ہوتی ہیں -"

اس کے ساتھ ہی رشید نے سلمہ کو زور سے اپنے سینے سے بھینچ لیا- سلمہ کے منہ سے چیخ نکل گئی - اس نے زور سے ایک چانٹا اسے مارا - رشید گھبرا کر پیچھے ہٹ گیا- سلمہ بھاگ کر اپنی کوٹھری میں چلی گئی - اندر جا کر وہ بیگم سے لپٹ گئی اور پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی - اس نے روتے روتے ہوئے سارا واقعہ ماں جی کو سنا دیا - بے چاری دکھیاری بڑھیا آنسو بہانے لگی -

"صبر کر بیٹی ! مصیبت تنہا کبھی نہیں آتی - اب سر پر پڑ گئی ہے تو اسے صبر شکر کر کے برداشت کرنا ہی ہو گا- عزت و آبرو اللہ کے ہاتھ میں ہوتی ہے- میں آج ہی ٹھیکیدارنی جی سے بات کر کے رشید کی شکایت کروں گی - وہ پھر تمہیں کبھی تنگ نہیں کرے گا -"

چنانچہ دوسرے روز بیگم نے ٹھیکیدارنی سے مل کر بے جا خرمستیوں کی شکایت کی - ٹھیکیدارنی نے بیگم کی ایک ایک بات غور سے سنی اور بولی -

"فکر نہ کرو بہن ! میں آج ہی اسے بلوا کر اس کے کان کھینچتی ہوں - میرے گھر میں یہ بدمعاشیاں نہیں ہو سکتیں- اگر وہ باز نہ آیا تو میں اس کا یہاں آنا جانا بند کر دوں گی- عزت سب کی سانجھی ہوتی ہے - تم بے فکر رہو-"

"خدا آپ کا بھلا کرے بہن جی ! اللہ تعالیٰ آپ کو ان باتوں کا ضرور اجر دے گا - خدا اپنے نیک بندوں کے ساتھ ہوتا ہے -"

اس واقعے کے تین روز بعد بیگم پر اچانک فالج کا حملہ ہو گیا- وہ اپنی کوٹھری میں بستر پر پڑی لیٹی تھیں - بیمار تو وہ کئی عرصے سے تھیں - اس روز ان کی طبیعت زیادہ خراب تھی- سلمہ بچوں کو پڑھانے اوپر گئی ہوئی تھی- بیگم کو کسی چیز کی ضرورت محسوس ہوئی - انہوں نے بستر سے اٹھ کر دروازے تک جانے کی کوشش کی تو جسم گرتا گرتا سے محسوس ہوا- فوراً اپنے آپ کو بستر پر گرا دیا - اس کے بعد اچانک ان کے جسم کا بایاں حصہ سر سے لے کر پاؤں تک سن ہو گیا- جیسے پتھر ہو گیا ہو- انہوں نے ہلانے جلانے کی کوشش کی مگر کوئی بھی عضو اپنی جگہ سے ٹس سے مس نہ ہوا - دوپہر کو سلمہ ان کے لئے روٹی لے کر آئی تو دیکھا کہ ماں جی بے سدھ پڑی ہیں - چہرے کا بایاں حصہ ٹیڑھا ہو گیا ہے- آنکھ بھینگی ہو گئی ہے - انہوں نے بولنے کی کوشش کی مگر بول نہ سکیں - اشاروں ہی اشاروں میں اپنے جسم کے بائیں حصے پر ہاتھ پھیر کر بتایا کہ فالج ہو گیا ہے- سلمہ روتی ہوئی ماں جی سے لپٹ گئی- بھاگی بھاگی ٹھیکیدارنی کے پاس گئی- ٹھیکیدارنی خود چل کر کوٹھڑی میں آئی - فوراً ڈاکٹر کو بلایا گیا- اس نے ٹیکہ لگایا- دوائی تجویز کی اور چل دیا-

اس نے ٹھیکیدارنی کو بتایا کہ بڑھاپے کا فالج ہے - شاید عورت جانبر نہ ہو سکے - اور ہوا بھی ایسا ہی - تین دن تک علاج ہوتا رہا لیکن قدرت کو بھی اب بیگم پر رحم آ گیا تھا- وہ اس بے کس عورت کو مزید مصائب کا شکار بنانا نہیں چاہتی تھی- چوتھے روز رات کے پچھلے پہر بیگم نے جان آفرین کے سپرد کر دی- سلمہ پاس ہی پڑی سو رہی تھی - صبح تک اسے علم نہ ہو سکا - دن چڑھا اور سلمہ نے بیگم کو اٹھانے کی کوشش کی تو معلوم ہوا کہ وہ اللہ کو پیاری ہو چکی ہیں - سلمہ چیخ مار کر لاش سے لپٹ گئی اور آنسو بہاتی رہی -

اسی روز دوپہر کو بیگم میر عصمت اللہ سابق مینیجر سٹی بنک و حال مفرور کو ایک ویران قبرستان کے گمنام گوشے میں دفن کر دیا گیا - اب سلمہ اس دنیا میں بالکل تنہا رہ گئی تھی - پہلے اسے بیگم کا بڑا سہارا تھا - اب وہ اپنے آپ کو اتنی بڑی دنیا میں اکیلی محسوس کر رہی تھی لیکن زندہ رہنا بھی بڑا ضروری تھا - زندہ رہتے ہوئے کوئی شخص مرنا نہیں چاہتا- سوائے ایسے شخص کے جو زندگی سے بالکل ہی عاجز آ گیا ہو - چنانچہ سلمہ اس گھر میں کام کرتی رہی- ٹھیکیدارنی نے رشید کے کان کھینچ دیئے تھے اور اب وہ بہت کم وہاں آتا تھا اور سلمہ کو بالکل تنگ نہیں کرتا تھا

سلمہ کو اپنے چچا کی ایک مدت سے کوئی خبر نہیں ملی تھی- اور اس کی خبر اس بے چاری کو بھلا کیسے مل سکتی تھی ؟ باقی اسلم جیل میں تھا- شروع میں دونوں عورتوں نے ملاقات کی کوشش کی - مگر ملاقات نہ ہو سکی - بعد ازاں انہیں معلوم ہوا کہ اسلم کو ایک دور دراز شہر کے جیل خانے میں تبدیل کر دیا گیا ہے- حقیقت یہ تھی کہ اسلم کو کسی شہر میں تبدیل نہیں کیا گیا تھا - وہ اسی شہر کی جیل میں تھا جس شہر میں اس کی ماں دفن تھی اور جہاں سلمہ معمولی خادمہ کی حیثیت سے ایک گھر میں نوکری کر رہی تھی ، جیل کے ملازموں نے غلطی سے ان عورتوں کو کہہ دیا تھا کہ اسلم وہاں نہیں ہے -

جیل میں اسلم کو تیسرا سال جا رہا تھا ۔ اس کی شرافت ساری جیل میں مشہور ہوگئی تھی ۔ اس نے کبھی کسی سے لڑائی جھگڑا بھی نہیں کیا تھا ۔ کبھی کسی سے اونچی بات نہیں کی تھی ۔ جیل کا وارڈن اس کا بڑا خیال کرتا تھا ۔ اس نے کبھی اس کی بے عزتی نہیں کی تھی اور کبھی اسے کسی بات کے لئے تنگ نہیں کیا تھا ۔ اسلم کی زندگی کے شب وروز بڑی یکساں روانی کے ساتھ گزر رہے تھے ۔ صبح سویرے اٹھنا ' کام کرتے قیدیوں کی حاضری لگانا ' ان کے کام کی نگرانی کرنا ۔ دوپہر کو پھر ان کی حاضری لگانا ' ان کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھانا ' انہیں پھر کام پر لگا دینا ' شام کو پھر ان کی حاضری لینا ' دن بھر انہیں ضرورت کی اشیاء مہیا کرتے رہنا ' ان کی کارگزاری کو رجسٹر میں نوٹ کرنا ' رات کو انہیں بارک میں لے جانا اور دوسرے قیدیوں کے ساتھ خود بھی بوریئے پر سو جانا ' بس یہ تھا وہاں کی زندگی کا معمول ۔ قیدی بھی اسلم کی بڑی عزت کرنے لگے تھے اور اس کے سامنے اپنا ہر دکھ درد بیان کرتے کبھی بھی نہیں ہچکچاتے تھے۔

اس روز اسلم کام کرتے ہوئے قیدیوں کے پاس بوریئے پر بیٹھا ان سے باتیں کر رہا تھا کہ وارڈن اندر آیا ۔ اسلم اٹھ کر کھڑا ہوگیا ۔ وارڈن اسلم نے پاس کے پاس آکر کہا۔

"جیلر صاحب کی کوٹھی کے ساتھ والی زمین میں ایک سرکاری عمارت بننے والی ہے ۔ جیلر صاحب کا خیال ہے کہ کچھ قیدیوں کو وہاں زمین کی کھدائی اور دوسرے ابتدائی کاموں پر لگا دیا جائے ۔ اس طرح قیدیوں کو کھلی ہوا میں کام کرنے کا موقعہ بھی ملے گا اور سرکاری خزانے میں بچت بھی ہوگی ۔ اس کام کے لئے ہمیں فی الحال پچاس قیدیوں کی ضرورت ہے ۔ میرا ارادہ تمہیں ان پچاس قیدیوں کی ٹولی کا انچارج بنا کر بھجوانے کا ہے۔"

اسلم نے مسکرا کر کہا۔

"میں ہر خدمت کے لئے حاضر ہوں ۔ جیسے آپ کا حکم ہوگا ' بجا لاؤں گا۔"

"تو پھر کل تم ان قیدیوں کے ساتھ تیار رہنا ۔ صبح ان لوگوں کو وہاں جا کر کام کرنا ہوگا ۔ جیلر صاحب کی کوٹھی جیل کے ساتھ ہی ہے۔"

"بہت اچھا جناب !"

اس کے بعد وارڈن نے قیدیوں کو مخاطب کرکے یہ ساری باتیں ان کے ذہن نشین کر دیں اور ایک مختصر سی تقریر میں ان پر یہ بات واضح کر دی کہ اگر انہوں نے وفاداری ' ایمان داری اور ذمہ داری سے کام کیا تو جیلر صاحب ان کی سزائیں سرکار کو لکھ کر معاف کروانے کی بھی کوشش کریں ۔ جب وارڈن چلاگیا تو قیدیوں نے اپنے اپنے انداز میں تبصرہ شروع کر دیا۔

ایک بولا۔

"ہمارا کیا ہے چاہے بھاڑ میں جھونک دیں۔"

دوسرا بولا۔

"ارے میاں ! ہم تو قیدی ہیں قیدی ! جیل سے باہر بھی جائیں تو قیدی ہی رہیں گے ۔ کوئی آزادی تھوڑے ہی مل جائے گی۔"

تیسرا بولا۔

"ٹھیک ہے بھائی ! لیکن دوستو ! جیل سے بھاگنے کا نادر موقعہ ہوگا۔"

اسلم نے دل ہی دل میں طے کر لیا کہ اس قیدی کو وہ کسی صورت اپنے ساتھ نہیں لے جائے گا۔"

چوتھا قیدی کہنے لگا۔

"میاں جیل سے بھاگ کر صرف ایک ہی راستہ سامنے ہوتا ہے جو قیدی کو پھر قید خانے میں لے آتا ہے اور سزا میں مزید اضافہ ہو جاتا ہے ۔ اس لئے بہتر ہے کہ جیسے بھی ہو ' اسی سزا کے دن پورے کرلیں اور پھر کان پکڑ لو کہ کبھی کوئی برا کام نہیں کریں گے۔"

صبح صبح وارڈن بارک میں آگیا ۔ اس نے اسلم کو ساتھ لیکر سارے قیدیوں کو ایک قطار میں کھڑا کر دیا ۔ اسلم نے ان سب کا نام دوبارہ ایک رجسٹر میں درج کیا ۔ ان کی حاضری لگائی ۔ دو دو کی قطار میں قیدیوں کی یہ ٹولی بندوق بردار سپاہیوں کی معیت میں جیل سے سے باہر نکل آئی ۔ باہر آکر بھی قیدیوں نے بڑی رحم طلب اور پر شوق نگاہوں سڑک کو' سڑک کے پار مکانوں کو ' سڑک پر آنے جانے والوں آزاد لوگوں کو دیکھا اور کلیجہ مسوس کر رہ گئے ۔ سامنے والے ہوٹل پر ریکارڈ بج رہے تھے اور کچھ لوگ بیٹھے چائے پی رہے تھے ۔ اور گپ بازی کر رہے تھے ۔ یہ آزاد لوگ تھے ۔ ان قیدیوں کی نظر میں انہیں دنیا جہان کی کوئی فکر نہیں تھی ۔ وہ جب چاہیں اور جہاں چاہے جا سکتے ہیں لیکن انہیں اس بات کی خبر نہیں تھی کہ وہ لوگ بھی ان کی طرح اپنے اپنے خیالات میں قیدی تھے ۔ انہوں نے بھی اپنے اردگرد جیل کی چھوٹی چھوٹی چار دیواریاں کھڑی کر رکھی تھیں جن میں وہ قید تھے اور جہاں وہ ساری عمر باہر نہیں نکل سکتے تھے ۔ صرف موت ہی انہیں اس جیل خانے سے نجات دلا سکتی تھی۔

جیلر کی کوٹھی بڑی خوشنما اور نئی تھی ۔ لان میں گھاس اگی ہوئی تھی اور تروتازہ پھول صبح کی ہوا میں لہرا رہے تھے ۔ ساتھ والے پلاٹ میں ٹھیکیدار اور جیلر صاحب کھڑے تھے ۔ قیدیوں کی لائن لگا دی گئی ۔ جیلر صاحب دراز قد اور دبلے پتلے آدمی تھے جن کے چہرے پر بڑی ہمدردانہ چمک تھی ۔ انہوں نے مسکرا کر ایک ایک قیدی سے اس کی خیروعافیت دریافت کی اور مختصر سی تقریر میں کام کی نوعیت سمجھا دی ۔ اس کے بعد انہیں اوزار وغیرہ پکڑا دیئے گئے اور کام شروع ہوگیا ۔ کچھ قیدی زمین کی کھدائی کرنے لگے اور کچھ پتھر اور اینٹیں توڑ توڑ کر بجری بنانے لگے ۔

کچھ لکڑیاں چیرنے اور انہیں چھیلنے لگے۔ دوپہر تک کام کرتے رہنے کے بعد انہیں وہیں روٹی کھلائی گئی۔ ایک گھنٹے کی تفریح کے بعد پھر کام شروع ہوگیا۔

اسلم چل پھر کر کام کا جائزہ لیتا رہا۔ اس نے بھی دوسرے قیدیوں ایسا لباس پہن رکھا تھا۔ فرق صرف اتنا تھا کہ اس کے ہاتھ میں رجسٹر تھا اور کان میں پینسل اڑی ہوئی تھی۔ تیسرے پہر وہ اینٹوں کے ایک چبوترے پر بیٹھ گیا اور قیدیوں کا کام کرتے دیکھنے لگا۔ جہاں وہ بیٹھا تھا۔ وہاں سے اسے ساتھ ہی جیلر صاحب کی کوٹھی کا لان صاف دکھائی دے رہا تھا۔ اس لان میں دو لڑکیاں بیڈ مٹن کھیل رہی تھیں۔ دونوں لڑکیاں شلوار قمیض میں ملبوس تھیں اور دوپٹے انہوں نے کمر کے گرد کس رکھے تھے۔ ذرا پرے ایک نو عمر لڑکا کچھ کھا رہا تھا اور ان لڑکیوں کے کھیل کو دل چسپی سے دیکھ رہا تھا۔ لڑکیاں ساتھ ساتھ ہنستی اور باتیں بھی کرتیں جاتیں تھیں۔ اسلم انہیں دیکھ کر یونہی دل میں ایک درد سا محسوس کر رہا تھا۔ کبھی وہ بھی آزاد ہوا کرتا تھا۔ اور اس قسم کی خوش پوش لڑکیاں اس کی دوست ہوا کرتیں تھیں۔ لیکن اب وہ قیدی تھا۔ قید میں پڑا تھا۔ ایک پل کے لئے شہر کی کھلی سڑکوں پر نہیں پھر سکتا تھا۔ کسی شریف گھر کی پڑھی لکھی لڑکی سے بات نہیں کر سکتا تھا۔ ہر کوئی اسے بدمعاش اور مجرم سمجھتا تھا۔ کوئی اس سے دو باتیں کرنی بھی گوارا نہیں کرتا تھا۔ کتنی ہی دیر وہ وہاں بیٹھا رہا۔ ان لڑکیوں کو بیڈ مٹن کھیلتے دیکھتا رہا۔ ان میں ایک لڑکی کی چوٹی تھی اور دوسری کے بال کٹے ہوئے تھے۔ چوٹی والی لڑکی کا قد ٹھگنا اور جسم بھاری تھا۔ کٹے بالوں والی لڑکی دبلی پتلی سی تھی اور رنگ کچھ نکھرا نکھرا تھا اور وہ بڑی پھرتی سے ریکٹ چلا رہی تھی اور بڑی چاق و چوبند تھی۔

تیسرے پہر کام ختم کر دیا گیا۔ اسلم نے چبوترے سے نیچے اتر کر ان کی حاضری لگائی اور انہیں ساتھ لیکر پھر واپس جیل آگیا۔ اس رات وہ کٹے ہوئے بالوں والی دبلی پتلی ہرنی ایسی کمر والی لڑکی کے بارے میں خواب دیکھتا رہا۔ پھر صبح اٹھ کر اپنے خوابوں پر خود ہی شرمندہ سا ہو کر ہنس پڑا۔ کہاں وہ ایک مفرور باپ کا مجرم قیدی بیٹا اور کہاں وہ خوبصورت، شریف اور اعلےٰ گھرانہ کی لڑکی!

صبح کو پھر کام کرنے قیدیوں کا قافلہ جیلر صاحب کی کوٹھی کی طرف چل پڑا۔ سارا دن قیدی کام کرتے رہے اور اسلم اس انتظار میں رہا کہ کسی طرح پھر سے اس لڑکی کی ایک جھلک نظر آجائے، لیکن ایسا نہ ہو سکا۔ دوپہر ہوگئی۔ دوپہر گزر گئی۔ لیکن وہ لڑکی پھر دکھائی نہ دی۔ آخر جب دوپہر ڈھلنے لگی اور ساتھ والی کوٹھی کے لان میں دھوپ سنہری ہوگئی تو اس نے دیکھا کہ وہی دونوں لڑکیاں ریکٹ ہاتھ میں لئے لان میں مسکراتی اچھلتی کودتی چلی آرہی ہیں۔

اسلم کے چہرے پر سرخی دوڑ گئی۔ وہ چپکے سے اینٹوں کے چبوترے پر چڑھ گیا اور چوری

چوری ان لڑکیوں کو بیڈ مٹن کھیلتے دیکھنے لگا۔ کٹے بالوں والی لڑکی نے نیلے رنگ کی قمیض پہن رکھی تھی اور کمر کے گرد سفید دوپٹہ اس طرح کس کر باندھا ہوا تھا کہ اس کی کمر بڑی پتلی دکھائی دے رہی تھی۔ ایک بار چوٹی والی لڑکی نے زور سے ریکٹ چلایا۔ گیند اچھل کر اسلم کے قریب والی جھاڑیوں کی طرف آگئی۔ اسلم نے اسے غور سے دیکھا۔ اسلم جھاڑیوں کی طرف یعنی کوٹھی کے باہر بیٹھا ہوا تھا۔ کٹے بالوں والی لڑکی بھاگ کر ان جھاڑیوں کی طرف آئی۔ اسلم نے غور سے دیکھا۔ اس کا رنگ کندن کی طرح دمک رہا تھا۔ چہرے پر پسینے ننھے منے کے قطرے موتیوں کی طرح چمک رہے تھے۔ گالوں پر سرخی دمک رہی تھی اور یوں جیسے تازہ تازہ کھلے ہوئے گلاب کے پھول ہوتے ہیں۔ اس لڑکی نے بھی یونہی ایک نظر اسلم کو دیکھا اور پھر جلدی سے گیند اٹھا کر واپس چلی گئی۔ اسلم کو یوں لگا کچھ ایسے لگا جیسے فضا میں کسی عطر کی خوشبو پھیل گئی ہو۔ کتنی ہی دیر وہ اپنی خیالی دنیا میں گم ہو کر رہ گیا۔

جب قیدیوں کی واپسی کی حاضری لگا رہا تھا تو اس نے دیکھا کہ وہ لڑکیاں بانہوں میں بانہیں ڈالے لان سے واپس کوٹھی کے برآمدے کی طرف جا رہی تھی۔ اسلم کے دل سے ہوک سی اٹھی اور وہ سینہ مسوس کر رہ گیا۔ اس کے بعد وہ پہلے روز کی طرح دوسرے قیدیوں کے ساتھ بندوق بردار سپاہیوں کی حفاظت میں واپس جیل میں آگیا۔ اس رات بھی اس نے بڑے سہانے خواب دیکھے اور بار بار اس کٹے بال والی لڑکی کو بال اٹھا اٹھا کر دیا۔ اور اس کے جسم اور کپڑوں سے اٹھنے والی عطر کی خوشبو کو بھی سونگھا۔

اگلے روز پھر وہ کھیل دہرایا جانے لگا۔ تیسرے پہر جب لان میں دھوپ کا رنگ سنہری ہو گیا تو وہ لڑکیاں روز کی طرح بیڈ مٹن کھیلنے لان میں آگئیں اسلم اینٹوں کے چبوترے پر چڑھ کر بیٹھ گیا اور ان لڑکیوں کے کھیل کا نظارہ کرنے لگا۔ اچانک چوٹی والی لڑکی نے زور سے ہٹ لگائی۔ اب کی دفعہ گیند اچھل کر کوٹھی کی جھاڑیوں والی دیوار پھلانگ کر اس طرف آن گری جدھر قیدی کام کر رہے تھے۔ کٹے بالوں والی لڑکی بھاگ کر جھاڑیوں کی طرف آئی اور ایڑیاں اٹھا کر اس طرف دیکھنے لگی۔ جہاں اسلم بیٹھا تھا۔ اسلم ایک دم اتر کر گیند کی طرف گیا۔ گیند اٹھا کر اس نے قمیض کے دامن سے صاف کیا۔ اور بڑے ادب سے بازو ادھر اٹھا کر اس لڑکی کو گیند پیش کیا۔ لڑکی نے فوراً ہاتھ بڑھا کر گیند پکڑ لی اور لان کی طرف بھاگ گئی۔

اسلم کو یوں لگا جیسے اس کی انگلیاں اس لڑکی کی انگلیوں سے چھو گئیں ہوں۔ اس کے سارے جسم میں ایک گرم گرم لہر دوڑ گئی۔ بہرحال وہ ایک کھاتے پیتے گھرانے کا چشم و چراغ تھا۔ پڑھا لکھا اور تہذیب یافتہ نوجوان اور ہر قسم کے جذبات سے بخوبی واقف تھا۔ اس نے اپنے اندر بڑی ہی رومانوی سی بیداری کے سورج کو طلوع ہوتے ہوئے محسوس کیا۔ اس رات وہ بالکل

نہ سو سکا اور ساری رات پہلو بدلتا رہا۔ لڑکی نے اس کی طرف ایک پل کے لئے ہی دیکھا تھا۔ وہ بڑی بے تابی سے دوسرے روز کا بھی انتظار کرنے لگا۔ وہ چاہتا تھا کہ رات درمیان میں کبھی نہ آئے اور سارا دن چبوترے پر بیٹھا ان لڑکیوں کا کھیل دیکھتا رہے۔ دوسرے روز وہ پھر وہاں جا کر بیٹھ گیا اور یونہی رجسٹر پر جھک کر کچھ اندراج کرتا رہا اور قیدیوں کے نام بار بار پڑھتا رہا۔ جب لڑکیاں بیڈ مشن کھیلنے آئیں تو وہ چوکنا ہو کر بیٹھ گیا اور چوری چوری انہیں اچھلتے، کودتے اور کھیلتے دیکھتا رہا۔ برسات کا موسم ختم ہونے والا تھا۔ فضا میں عام طور پر بڑا حبس رہتا تھا۔ بارشیں خوب ہو چکی تھیں اور راتیں ٹھنڈی ہونا شروع ہو گئیں تھیں۔ لڑکیاں بیڈ مشن کھیلتی رہیں اور ہنستی ہوئی باتیں بھی کرتیں رہیں۔ ایک بار پھر گیند اچھل کر جھاڑیوں میں جا گرا۔ کٹے بالوں والی لڑکی بھاگ کر گیند لینے گھس گئی۔ پھر کیا ہوا کہ اچانک اس نے ایک دلدوز چیخ ماری اور "سانپ" کہہ کر وہیں گر پڑی۔

پہلے تو اسلم کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ وہ ساکت سا ہو گیا۔ پھر اچانک اسے محسوس ہوا کہ لڑکی کو سانپ نے کاٹ لیا ہے۔ اس نے چبوترے پر سے رجسٹر پھینک کر لان میں دوسری طرف چھلانگ لگا دی۔ کٹے بالوں والی لڑکی گھاس پر بے ہوش پڑی تھی اور دوسری لڑکی شور مچا رہی تھی۔ اسلم نے فوراً لڑکی کی بائیں کلائی پر سرخ چھالا دیکھا۔ اس نے کچھ سوچے سمجھے بغیر فوراً چھالے کو دانت سے کاٹا اور منہ لگا کر پاگلوں کی طرح زہر چوسنا شروع کردیا۔ وہ بار بار زہر چوستا اور اسے تھوکتا جا رہا تھا۔ اس دوران میں سے جیلر صاحب اور خادمہ وہاں آ چکے تھے۔ انہوں نے اسلم کو لڑکی کی کلائی منہ کے ساتھ لگائے زہر چوس چوس کر تھوکتے دیکھا تو فوراً جھک کر لڑکی کا سر اپنے زانوں پر رکھ لیا اور اپنی ہی گھڑی اتار کر اس کا فیتہ لڑکی کی کلائی پر ذرا آگے کر کے خوب زور سے کس کر باندھ دیا۔ کوئی پانچ منٹ بعد اسلم نے تقریباً سارا زہر اس لڑکی کے جسم سے چوس کر باہر پھینک دیا۔ اس کے ہونٹوں پر زہر کی سیاہی خون کی سرخی میں ملی صاف دکھائی دے رہی تھی۔ جیلر نے فوراً بے ہوش لڑکی کو اٹھا کر باہر گھاس پر لٹا دیا اور دوسری لڑکی سے کہا۔

"نجمہ! فوراً ڈاکٹر کو فون کرو فوراً۔"

اس دوران لڑکی کو ہوش آگیا اور اس نے آہستہ سے آنکھیں کھول کر دیکھا۔ سامنے وہی قیدی کھڑا تھا جو چبوترے پر بیٹھا ہوتا تھا۔

"ڈیڈی!"

"یاسمین بیٹی!"

باپ بیٹی سے لپٹ گیا۔

جیلر نے اسلم سے کہا۔

"دیکھو میاں! تم فوراً اندر جاکر ڈیٹول سے غرارے کرو۔ یہ زہر خطرناک ہو سکتا ہے۔"

اسلم خادمہ کو اندر لے گئی۔ اس نے غسل خانے میں جاکر ڈیٹول ملے نیم گرم پانی سے اچھی طرح غرارے کئے اور باہر آگیا۔ اس وقت جیلر اپنی بچی کو بازوؤں پر اٹھائے اندر کمرے میں لئے جارہے تھے اور ڈاکٹر کی گاڑی کوٹھی کے احاطے میں داخل ہو رہی تھی۔

اسلم سے کسی نے کوئی بات نہ کی۔ وہ چپکے سے چلتا جھاڑیوں کے اوپر سے ہو کر دوسری طرف آگیا جہاں دوسرے قیدیوں نے اس کی جرات کی بڑی تعریف کی اور کہا کہ اب اس کی سزا میں ضرور کمی ہو جائے گی مگر اسلم کو صرف اس بات کی خوشی تھی کہ اس نے یاسمین کی جان بچانے کی کوشش کی تھی۔ اب خدا کرے کہ وہ اچھی ہو جائے۔ اس رات اسلم کو ہلکا سا بخار ہوگیا۔ دوسرے روز وہ بخار میں مبتلا رہا۔ شام کو وارڈن نے آکر اسلم کو بتایا کہ جیلر صاحب کی بچی کی جان بچ گئی ہے اور کل جیلر صاحب نے تمہیں کوٹھی پر بلایا ہے۔

"میاں! معلوم ہوتا ہے، تمہاری قید کے دن پورے ہوگئے۔"

میر صاحب کو ایبٹ آباد کے قرب وجوار میں اس دور افتادہ گاؤں میں ایک گمنام معلم کی زندگی بسر کرتے ہوئے تیسرا سال جا رہا ہے۔ اس دوران میں ان کی داڑھی مونچھیں بڑھ آئی ہیں۔ سر کے بال گردن پر لٹیں بن کر پھیلے رہتے ہیں۔ سر پر وہ یار قندی ٹوپی پہنے رکھتے ہیں۔ لباس مولویوں ایسا ہے۔ چہرہ اور وضع قطع بھی بالکل مولویوں ایسی ہو گئی ہے۔ ماتھے پر محراب پڑ گیا ہے۔ دن رات عبادت کرتے ہیں۔ بچوں کو پڑھاتے ہیں۔ گاؤں والوں میں ان کی شرافت اور نیک نفسی کی دھاک بیٹھی ہوئی ہے۔ وہاں انہوں نے اپنا نام بدل کر غلام دستگیر رکھا ہوا ہے۔ لوگ انہیں مولوی صاحب کہہ کر بلاتے ہیں۔ انہیں ایک نظر دیکھنے سے کوئی شخص نہیں پہچان سکتا کہ یہ وہی میر صاحب ہیں جو کبھی نجمہ کے ساتھ کلب میں بیٹھ کر داد عیش دیا کرتے تھے۔ جب کبھی انہیں اپنے بال بچوں اور بیوی کا خیال آتا ہے تو دل خون کے آنسو روتا ہے۔ انہیں کسی کی کوئی خبر نہیں نہ کسی کو ان کا کچھ علم ہے۔ دل میں ایک کانٹا ہمیشہ کھٹکتا ہے کہ کاش نجمہ سے اس کی زیادتیوں کا ایک بار تو انتقام لے لیا جائے۔

لیکن وہ کچھ نہیں کر سکتے تھے۔ شہر میں جانا خطرے سے خالی نہیں تھا۔ وہ لاکھ بہروپ بدلیں پولیس کی عقابی نگاہوں سے وہ کبھی نہیں بچ سکتے۔ اس گاؤں میں ایک نیا نیا پٹواری آکر لگا۔ یہ نوجوان لڑکا تھا اور شہر سے ابھی ابھی آیا تھا۔ میر صاحب نے محض شہر کی معلومات حاصل کرنے کے لئے اس سے باتوں ہی باتوں میں دوستی کر لی۔ اب یہ پٹواری دن میں ایک بار میر صاحب سے ضرور ملنے آتا ہے۔ اس پٹواری کا نام احمد قریشی تھا اور وہ لاہور میں ایف اے تک اسی

کالج میں پڑھتا رہا تھا جس کالج میں میر صاحب کا بیٹا اسلم پڑھا کرتا تھا۔ احمد قریشی نے ایف اے میں فیل ہو کر اپنے شوق کے لئے پٹوار کی ٹریننگ لی اور پٹواری بن کر یہاں آگیا۔ میر صاحب نے باتوں ہی باتوں میں بڑے طریقے سے پہلے اس کے کالج کا پھر اپنے بیٹے اسلم کا ذکر کیا۔

پٹواری نے بڑے افسوسناک لہجے میں کہا۔

"مولوی صاحب! کیا بتاؤں! اس بیچارے اسلم کا تو سارا کنبہ تباہ ہوگیا۔"

"کیوں کیا ہوا؟"

"آپ کو معلوم نہیں؟"

"نہیں تو ---- دراصل وہ لڑکا میرے بڑے لڑکے کا دوست تھا اور کبھی کبھی اس سے ملنے آیا کرتا تھا۔ پھر میرا بڑا لڑکا بھی افریقہ چلا گیا۔ بس اس کے بعد اس سے کبھی ملاقات نہیں ہوئی۔"

پٹواری نے سگریٹ سلگا کر کہا۔

"دراصل مولوی صاحب! اسلم کے کنبے کو ان کا باپ لے ڈوبا۔ جانے اس نے اپنی اولاد کو کیسی تربیت دے رکھی تھی۔ اسلم اچھا بھلا لڑکا ہوتا تھا۔ بس ایک آوارہ عورت کے چکر میں پھنس گیا اور اقدام قتل کر بیٹھا۔ اسے سات سال کی سزا ہوگئی۔

اس کے بعد کیا ہوا کہ اس کے باپ نے ---- جانے کیا نام تھا اس کا ---- بھول گیا ہوں۔ بہرحال اس شخص نے بنک میں لاکھوں روپے کا غبن کر لیا۔ وہ بنک مینیجر تھا۔ غبن کر کے بھاگ گیا اور آج تک بھاگا ہوا ہے۔ اب تو اس گھر پر پوری تباہی آگئی۔ سارا سامان ضبط ہوگیا۔ بنک والوں نے کوٹھی خالی کروا کر ماں بیٹی کو سڑکوں کی خاک چھاننے کیلئے چھوڑ دیا۔ کچھ دیر وہ لوگ ایک ہمسائے کے ہاں رہے۔ چند روز ہمارے ہاں رہے۔ بیچاری ماں جی تو غم سے آدھی رہ گئیں تھیں۔ پھر ہمارے ہاں سے بھی یہ لوگ چلے گئے اور ایک گھر میں برتن مانجھنے پر نوکر ہوگئے۔ آخر جوان لڑکی کو ساتھ لئے کوئی ستم زدہ عورت کہاں تک دربدر پھر سکتی تھی۔ پھر ایک روز میں نے سنا کہ اسلم کی والدہ کا انتقال ہوگیا۔ بڑا دکھ ہوا۔ سنا ہے کہ وہ جوان لڑکی بے چاری کسی کے ہاں برتن مانجھ کر اپنا پیٹ پال رہی ہے۔ مولوی صاحب! اس گھر پر تو خدا کا قہر ہی نازل ہوا ہے۔ خدا معاف کرے۔"

پٹواری کی باتیں سن کر میر صاحب کا سر چکرانے لگا۔ آنکھوں میں وحشت عود کر آئی۔ ہاتھ پاؤں ٹھنڈے ہونے لگے۔ حلق خشک ہوگیا۔ تن بدن میں آگ لگ گئی۔ انہوں نے ہاتھ بڑھا کر فضا میں ہلایا اور پھر چہرے پر پھیرنے لگے۔ پٹواری نے حیرانی سے میر صاحب کی اس حرکت کو دیکھا اور پھر اٹھ کر جانے لگا۔

میر صاحب نے پوچھا۔

"تو پھر اسلم کی والدہ اللہ کو پیاری ہوگئی؟"

"جی ہاں!"

"اور وہ بچی برتن مانجھتی ہے اور مصیبت کے دن گزار رہی ہے۔"

"جی ہاں۔"

"اور اسلم جیل میں ہے؟"

"ہاں! وہ تو بے چارہ اب سات سال تک وہیں رہے گا۔"

"اچھا تو میر صاحب کا پھر کچھ پتہ نہ چلا۔ اس ظالم کو اس کے جرم کی سزا نہیں دی گئی؟"

پٹواری نے نفرت سے کہا۔

"اجی مولوی صاحب! اگر وہ ظالم شخص مجھے مل جائے تو میں اس کی مرمت کروں کہ اسے نانی یاد آجائے۔ محض اس شخص کی وجہ سے اس کنبے پر تباہی نازل ہوئی۔"

"اچھا مولوی صاحب! اب میں چلتا ہوں ---- خدا حافظ۔"

"خدا حافظ!"

پٹواری احمد قریشی چلا گیا۔ میر صاحب اس وقت نیم کے ایک درخت تلے چارپائی پر بیٹھے تھے۔ پٹواری کے چلے جانے کے بعد انہوں نے محسوس کیا کہ صرف وہی اپنے گھر کی' اپنے بچے کی' اپنی بیوی کی اور سلمہ کی تباہی کے ذمہ دار ہیں۔ ان کا گھر بار اجڑ کر رہ گیا تھا۔ بیوی مر گئی تھی۔ بے کسی اور کسمپرسی کی موت' بیٹا جیل میں تھا۔ بھائی کی بیٹی دوسرے کے جھوٹے برتن مانجھ کر گزارہ کر رہی تھی اور وہ خود تباہ حال' گمنامی اور بے بسی کی زندگی بسر کر رہے تھے۔ نہ بھائی' نہ بیوی نہ بچہ نہ کوئی گھر تھا۔ یہ سب چیزیں ایک وقت ان کے ساتھ تھیں لیکن پھر ایسی آندھی چلی کہ سب کچھ بکھر اور بچھڑ کر رہ گیا۔ آخر وہ کیوں اس جگہ بیٹھے ہیں؟ وہ کب تک اس طرح وہاں بیٹھے رہیں گے؟ وہ کیوں اپنی اور اپنے گھر کی بربادی کا انتقام نہیں لیتے؟ کیا نجمہ انہیں تباہ کر کے خود آرام و آسائش کی زندگی بسر کرتی رہے گی؟ نہیں! کبھی نہیں! میر صاحب اچانک چارپائی پر سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ ان کے چہرے پر ایک عزم کی جگہ ایک وحشت برس رہی تھی۔

انہوں نے اپنی کوٹھڑی میں جا کر جو روپے جمع کر رکھے تھے' جیب میں ڈالے۔ چادر کندھے پر رکھی اور کسی کو اطلاع دیئے بغیر اس چھوٹی سی پگڈنڈی پر ہو لئے جو اوپر بڑی سڑک جا نکلتی تھی۔ کوئی ایک گھنٹے بعد وہ حویلیاں جانے والی سڑک پر آگئے۔ یہاں وہ ایک بس میں بیٹھ کر حویلیاں پہنچ گئے۔ وہاں سے انہوں نے شام کی گاڑی پکڑی اور راولپنڈی آگئے۔ راولپنڈی سے رات کو

ایک گاڑی لاہور کو جاتی تھی ۔ وہ اس گاڑی کے انتظار میں تھرڈ کلاس کے انتظار خانے میں جا کر بیٹھ گئے ۔ تھوڑی ہی دیر بعد گاڑی لاہور کی طرف روانہ ہوگئی۔

صبح سویرے میر صاحب لاہور پہنچ گئے ۔ لاہور میں تین سال کے بعد بھی کوئی فرق نہیں آیا تھا ۔ اس شہر کی رونق اور چہل پہل بالکل اسی طرح تھی ۔ سٹیشن کے باہر آکر بس میں سوار ہو کر سیدھے نورجہاں کے مقبرے پر پہنچ گئے ۔ سارا دن وہاں بیٹھے رہے ۔ دوپہر کو انہوں نے تندور پر سے روٹی کھائی ۔ پھر وہاں سو گئے ۔ شام کو وہیں سے تھوڑا بہت کھایا اور ادھر ادھر چکر لگاتے رہے ۔ ان کا حلیہ اتنا بدل چکا تھا کہ کوئی انہیں پہچان ہی نہیں سکتا تھا ۔ شہر میں آکر وہ ایک سینما میں داخل ہوگئے ۔ وہاں سے رات کو بارہ بجے باہر نکلے اور چپ چاپ اس سڑک کی طرف چل پڑے جہاں ان کی کوٹھی ہوا کرتی تھی ۔ کوٹھی کے دروازے پر کسی دوسرے آدمی کا نام لکھا تھا جو اب اس جگہ کا منیجر تھا ۔ صرف کونے والے کمرے میں ہلکی ہلکی روشنی ہورہی تھی ۔ کبھی یہ میر صاحب کی خواب گاہ ہوا کرتی تھی ۔ کبھی میر صاحب اس کمرے کے اندر شاندار پلنگ پر لیٹ کر اپنی پیاری بیوی سے پیاری پیاری باتیں کیا کرتے تھے لیکن وقت نے پانسا پلٹ دیا تھا ۔ حالات بدل گئے تھے ۔ تقدیر نے ان سے ان کی بادشاہی چھین کر انہیں سڑکوں پر دربدر پھرنے کے لئے اکیلا اور بے یارو مددگار چھوڑ دیا تھا۔

میر صاحب کی آنکھوں میں آنسو آگئے انہوں نے کندھے والی میلی چادر سے آنسو پونچھے اور دل میں بھڑکتی ہوئی آگ کو چھپائے نجمہ کی کوٹھی کی جانب چل پڑے ۔ اس رات نجمہ نے اپنے نئے شکار کے ساتھ کلب میں داد عیش دینے کے بعد ابھی ابھی کوٹھی میں آئی تھی اور کپڑے بدل کر وائن کا ایک ہلکا سا جام لینے کے بعد بستر میں گھسی ہی تھی ۔ پہلے اس نے کچھ پڑھنے کوشش کی اور پھر بتی گل کر کے سونے کی کوشش کرنے لگی ۔ چند ایک لمحات کے بعد اسے نیند آگئی اور وہ سو گئی ۔ عین اسی وقت میر صاحب اس کی کوٹھی کے عقبی حصے میں دیوار پھلانگ کر داخل ہو چکے تھے اور بڑی احتیاط سے چاروں طرف دیکھتے' پھونک پھونک کر قدم رکھتے نجمہ کی خواب گاہ کی کھڑکی کی طرف بڑھ رہے تھے ۔ وہ اس کوٹھی کے تمام حدود اربعے سے واقف تھے ۔ اس لئے انہیں خواب گاہ کی پچھلی کھڑکی تک پہنچنے میں کسی قسم کی دقت نہ ہوئی ۔ جب انہوں نے آہستہ سے کھڑکی کواندر کی طرف دبایا تو معلوم ہوا کہ کھڑکی اندر سے بند ہے ۔ انہیں ناامیدی ہوئی ۔ وہاں سے وہ فوراً دوسری طرف کو ہٹ گئے ۔ اب انہوں نے ایک چھوٹے برآمدے میں سے گزر کر درمیانی دروازے میں جانے کی کوشش کی لیکن یہ دروازہ بھی اندر سے بند تھا ۔ میر صاحب پریشان ہوگئے ۔ انہیں اچانک ہی خیال آیا کہ ہو سکتا ہے کہ نجمہ کی خواب گاہ کے ساتھ منسلک غسل خانے کی کھڑکی یا دروازہ کھلا ہو۔

چنانچہ یہی ہوا۔ غسل خانے کی کھڑکی تو بند تھی لیکن اتفاق سے دروازہ کھلا رہ گیا تھا۔ میر صاحب بڑے آرام سے ہی غسل خانے میں داخل ہو گئے۔ وہ غسل خانے کے اندھیرے میں کھڑے تھے۔ وہ آہستہ آہستہ چلتے اس دروازہ کی طرف آئے جو نجمہ کی خواب گاہ میں کھلتا تھا۔ انہوں نے دو انگلیوں کی مدد سے آہستہ سے دروازہ کو اپنی طرف کھینچنا شروع کیا۔ اب انہوں نے دیکھا کہ سامنے والے روشندانوں اور کھڑکی کے شیشوں میں سے چاندنی کی ہلکی ہلکی روشنی اندر آ رہی تھی اور نجمہ پلنگ پر اس طرح بے سدھ ہو کر لیٹی تھی کہ اس کا سینہ ننگا ہو رہا تھا۔ دبے پاؤں خواب گاہ میں داخل ہو کر انہوں نے پلنگ کے عقب میں آکر کھڑکی کے پردے گرا دیئے۔ اس خیال سے کہ اگر نجمہ بیدار ہو جائے اور بتی جلا دے تو باہر کچھ دکھائی نہ دے ۔ پھر وہ نجمہ کی پائنتی کی طرف آکر چپ چاپ کھڑے ہو گئے اور سوئی ہوئی نجمہ کو تکنے لگے ۔ یہی وہ ناگن تھی جس نے ان کے سارے خاندان کو ڈس کر ہلاک کر دیا تھا۔

میر صاحب نے پہلے سوچا کہ اسے قتل کرنے سے پہلے جگا لیا جائے تاکہ نجمہ کو معلوم ہو جائے کہ اس کا قاتل کون ہے اور یہ کہ میر صاحب نے ان سے انتقام لیا ہے۔ پھر یہ خیال آیا کہ نجمہ شور مچا دے گی اور سارا کھیل بگڑ جائے گا۔ نہ صرف یہ کہ نجمہ انتقام کی آگ سے بچ جائے گی بلکہ وہ بھی گرفتار کر لئے جائیں گے۔ یہی بہتر ہے کہ اس ناگن کو سوتے میں ہی قتل کر دیا جائے۔ میر صاحب نے اس فیصلے کے ساتھ ہی کمر کے گرد بندھا ہوا برف توڑنے والا سوا نکال کر دائیں ہاتھ میں بالکل سیدھے رخ پر پکڑا اور قدم قدم چلتے نجمہ کے بالکل قریب آ گئے۔ اتنا قریب کے اب انہیں نجمہ کے سانس لینے کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی۔ میر صاحب نے ضرب لگانے کے لئے نجمہ کی بائیں چھاتی کا نچلا حصہ چنا ۔ یہاں دل تھا اور ضرب لگنے کے بعد نجمہ فوراً ختم ہو جائے گی اور آواز تک بھی نہ نکال سکے گی۔ انہوں نے بے خبر سوئی ہوئی عورت کو آخری بار دیکھا ۔ آنکھوں میں اس کی چرترکاریوں ' مکاریوں اور بے وفائیوں کی ساری تصویریں پھر گئیں۔ پھر انہیں خیال آیا کہ انکی بیگم کا جنازہ جا رہا ہے اور کوئی رونے والا نہیں ۔ بیٹا جیل میں مشقت کر رہا ہے اور بھائی کی بیٹی ایک کوٹھڑی کے فرش پر لیٹی اپنی قسمت کو رو رہی ہے ۔

اس خیال کے ساتھ ہی میر صاحب نے بڑے ٹھنڈے دل والے قاتل کی طرح سوئے کی نوک کا رخ نجمہ کی عریاں چھاتی کے ذرا نیچے کیا اور بجلی ایسی تیزی کے ساتھ اسے پوری قوت سے نجمہ کے جسم میں پورے کا پورا گھونپ دیا۔ میر صاحب کا خیال بالکل غلط ثابت ہوا۔ نجمہ کی لاش چارپائی سے ایک فٹ اوپر اچھلی۔ ایک دلدوز ' خوفناک ' اندوہناک اور دہشتناک چیخ فضا میں بلند ہو گئی اور میر صاحب سوا جسم کے اندر ہی چھوڑ کر غسل خانے کے دروازے میں سے ہو کر

کوٹھی کی دیوار پھلانگ کر باہر کھیتوں میں آ گئے اور انہوں نے دور ایک گاؤں کی طرف بھاگنا شروع کر دیا۔ راستے میں ایک کتے نے ان کا تعاقب کیا۔ میر صاحب نے پتھر اٹھا کر اس پر پھینکا۔ کتا بھاگ گیا ۔ میر صاحب برابر گاؤں کی طرف ہی بھاگتے چلے گئے۔ گاؤں کو پیچھے چھوڑ کر وہ آگے نکل گئے۔ ان کا دم پھولا ہوا تھا ۔ ٹانگوں میں طاقت نہیں تھی مگر وہ برابر بھاگے چلے جا رہے تھے ۔ اب ایک نالا آ گیا ۔ نالے کا پاٹ چوڑا تھا ۔ لیکن اس میں پانی کی ایک لکیر چلی آ رہی تھی۔ میر صاحب نالے کو پار کر کے دوسری طرف آ گئے۔ یہاں اب ریلوے لائن تھی ۔ چاند کی ہلکی روشنی میں ریلوے لائن کی پٹڑیاں چمک رہی تھیں۔ ریلوے لائن عبور کر کے میر صاحب ایک کلر زدہ سفید میدان میں سے گذرنے لگے۔ یہاں سے نکل کر وہ ایک نہر کے چھوٹے سے پل پر سے ہو کر پھر کھیتوں میں آ گئے۔ یہاں مال گاڑی کا ایک ٹوٹا پھوٹا ڈبہ الٹا پڑا تھا۔ میر صاحب اس ڈبے کے اوپر چڑھ کر بیٹھ گئے اور سانس درست کرنے لگے۔ کوئی گھنٹہ بھر وہ اس اوندھے پڑے مال گاڑی کے ڈبے پر بیٹھے سوچتے رہے کہ وہ کیا کر آئے ہیں۔ انہیں یقین نہیں آ رہا تھا کہ انہوں نے کوئی قتل کیا ہے ۔ انہوں نے تو انتقام لیا تھا ۔ اپنا انتقام ' اپنی بیوی اور بچوں کا انتقام ! لیکن لاش تو ایک فٹ اوپر اچھلی تھی اور وہ دہشت ناک چیخ سی کیا بلند ہوئی تھی ۔

میر صاحب کو ایک بار پھر وہی چیخ سنائی دی ۔ انہیں نجمہ کو سکڑا ہوا چہرہ اور شدید کرب کے عالم میں باہر کو نکلی ہوئی آنکھیں دکھائی دیں ۔ اور انہوں نے ڈر کر منہ دوسری طرف پھیر لیا۔ اوپر چاند ۔ تیسری چوتھی تاریخ کا باریک چاند چمک رہا تھا ۔ چاند کی کمان بھی یکلخت سیدھی ہو کر سوا بن گئی اور میر صاحب کی طرف تیزی سے بڑھنے لگی۔ میر صاحب کے منہ سے چیخ سی نکل گئی ۔ انہیں اپنی چیخ کی آواز اجنبی سی محسوس ہوئی ۔ پھر فوراً ہی سنبھل گئے اور وہ سوچنے لگے کہ انہیں کیا ہو گیا ہے۔ تھوڑی دیر چپ چاپ بیٹھے رہنے کے بعد پھر ایک لہر سی آئی اور میر صاحب کا سر چکر کھا گیا اور انہیں اپنے چاروں طرف خون کے فوارے بھی اچھلتے دکھائی دیئے ۔ پھر بے شمار کتے ان کی طرف دیکھ کر زور زور سے بھونکنے لگے ۔ انہوں نے نیچے اتر کر ریلوے لائن سے پتھر اٹھا اٹھا کر ان خیالی کتوں کی طرف پھینکنا شروع کر دیئے ۔

" بھاگ جاؤ ۔ ہت تیرے کتوں کی .... دفع ہو جاؤ ......"

وہ زور زور سے بولے جاتے تھے جن کا حقیقت میں کوئی وجود نہیں تھا ۔ اسی طرح بولتے ' شور مچاتے ' پتھر پھینکتے وہ ریلوے لائن کے ساتھ ساتھ بھاگتے چلے گئے ۔

میر صاحب اپنا ذہنی توازن کھو چکے تھے !

نجمہ کی خوفناک چیخ کی آواز سن کر ملازمہ دوڑ کر اس کے کمرے میں آ گئی۔ اندر آ کر جب

اس نے اپنی مالکہ کو خون میں لت پت قالین پر تڑپتے دیکھا تو چیخ مار کر باہر بھاگ گئی ----- دوسری کوٹھی میں جا کر اس نے سب لوگوں کو بیدار کر دیا۔ فوراً پولیس کو فون کر دیا گیا۔ ڈاکٹر کو فون کیا گیا۔ پولیس بھی آ گئی۔ ڈاکٹر بھی آ گیا لیکن اس وقت تک نجمہ ٹھنڈی ہو چکی تھی ۔ وہ خون کے ایک چھوٹے سے تالاب میں مردہ پڑی تھی۔ آنکھیں پتھرا کر اوپر کو چڑھ گئی تھیں ۔ چہرہ شدت کرب سے سکڑ کر چھوٹا ہو گیا تھا---- ہاتھوں کی مٹھیاں اندر کو بھینچی ہوئی تھیں۔ پولیس نے لاش کو اپنے قبضے میں لے کر ساری چیزوں کا جائزہ لیا ۔ قاتل کی تلاش میں ایک پارٹی کو دوڑایا گیا۔ مگر نجمہ کو اب ان پیش بندیوں سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ پرویز کو بھی فون کیا گیا۔ وہ بھاگا بھاگا آیا اور نجمہ کی لاش کو دیکھ کر سکتے میں آ گیا ۔

قدرت اپنے کھیل کا ایک پردہ گرا چکی تھی ۔ اب دوسرا پردہ اٹھنے والا تھا۔ کھیل کا آخری حصہ شروع ہونے والا تھا ۔

موت آ گئی نہ ہو مرے ذوق امید کو
محرومیوں میں کیف سا پانے لگا ہوں میں

قیدیوں کے لباس میں اسلم بندوق بردار سپاہی اور وارڈن کی معیت میں جیلر صاحب سے ملنے انکی کوٹھی پر گیا تو اس وقت وہ اپنی کوٹھی کے لان میں بیٹھے تھے ۔ ان کی بیٹی یاسمین بھی ان کے پاس ہی کرسی پر نیم دراز تھی ۔ اس کے چہرے پر نقاہت کے آثار تھے۔ رنگ کچھ پیلا ہو رہا تھا اور کلائی پر پٹی بندھی تھی ۔ اسلم نے جا کر سلام کیا اور چپ چاپ کھڑا ہو گیا ۔ جیلر نے سپاہی اور وارڈن کو واپس بھجوا دیا۔ جب وہ چلے گئے تو ملازمہ سے کہہ کر کرسی منگوائی اور اسلم سے کہا ۔

" بیٹھ جاؤ ۔ "

اسلم کرسی پر بیٹھ گیا ۔ اس نے محسوس کیا کہ یاسمین اس کی طرف بڑی محبت آمیز اور احسان مند نگاہوں سے دیکھ رہی تھی ۔ جیلر نے بڑی شائستگی سے پوچھا ۔

" تمہارا نام اسلم ہے ؟ "

" جی ہاں۔ "

" تم نے ایک عورت کو قتل کرنے کی کوشش کی تھی ؟"

" جی ہاں۔ "

"کیا وجہ ہوئی تھی ؟"

اسلم ایک پل کے لئے خاموش رہا۔ پھر آہستہ سے نگاہیں اٹھا کر بولا ۔

" یہ ایک لمبی کہانی ہے "

" تمہاری تعلیم کتنی ہے ؟"

" ایف ۔ اے ۔ "

" تمہارے والد بنک میں مینیجر تھے ؟ "

" جی ہاں۔ "

" تمہارے اور بہن بھائی بھی ہیں ؟"

" ماں تھی وہ مرگئی اور کوئی نہیں ۔"

یاسمین کا چہرہ اداس سا ہوگیا تھا ۔ جیلر صاحب نے پوچھا ۔

" تمہاری اپنے والد صاحب سے بھی پھر ملاقات نہیں ہوئی ؟"

" جی نہیں ۔"

ایک منٹ کے لئے وہاں خاموشی طاری ہو گئی ۔ اس دوران میں خادمہ چائے لے آئی ۔

جیلر نے خود ایک پیالی بنا کر اسلم کو دی ۔ اسلم نے شکریہ ادا کرتے ہوئے پیالی پکڑ لی اور چائے پینے لگا ۔

" بسکٹ بھی کھاؤ ۔ "

" شکریہ ! میں چائے کے ساتھ کبھی کچھ نہیں کھایا کرتا۔ "

جیلر ہنس پڑا ۔

" وہ کیوں ؟"

" بس عادت نہیں ہے۔ "

یاسمین نے پوچھا ۔

" جیل کی زندگی کیسی رہی ؟"

" یہ تو جیل مین رہ کر ہی معلوم ہو سکتا ہے ۔"

جیلر اوز یاسمین دونوں مسکرانے لگے۔ جیلر نے ملائمت سے کہا ۔

" میں تمہارا بہت بہت شکرگزار ہوں اسلم ۔ تم نے میری بچی کی جان بچا کر مجھ پر بڑا احسان کیا ہے ۔"

اسلم نے کہا ۔

" یہ تو میرا انسانی فرض تھا جناب ! میری جگہ اگر کوئی دوسرا انسان ہوتا تو وہ بھی یہی کرتا

جو میں نے کیا ۔"

" نہیں اسلم ! تم خوش فہمی میں مبتلا ہو ۔ آج کے زمانے میں ایسا نہیں ہوا کرتا ۔ اس دور میں صرف وہی شخص تعریف کا مستحق ہے جو جراءت سے کام لے کر پہل کر گذرتا ہے۔ بہرحال تم ایک بہادر اور صحیح انسان ہو۔ ڈاکٹروں نے کہا ہے کہ اگر سانپ کا زہر اسی وقت چوس نہ لیا جاتا تو یہ کسی صورت بھی نہیں بچ سکتی تھی ۔ کیونکہ سانپ زہریلا تھا۔ میں نے سنا تھا کہ تم بیمار پڑ گئے تھے ۔ اب طبیعت کیسی ہے ؟"

اسلم نے نظریں جھکا کر کہا ۔

" خدا کا شکر ہے ۔"

دیکھو اسلم ! تم اس گھر بھی اپنا ہی گھر سمجھو ۔ اگر تمہیں جیل میں کسی قسم کی تکلیف ہو تو بلا جھجک یہاں آ کر تم مجھے بیان کر سکتے ہو۔ میں تمہاری تکلیف کو رفع کرنے کی ہر ممکن سعی کروں گا۔ تم ایک شریف خاندان کے پڑھے لکھے فرزند ہو ۔ محض قسمت کے چکر میں پھنس کر تم یہاں آ گئے ہو۔ ایسا زندگی میں ہو جایا کرتا ہے ۔ تمہیں خدا کی رحمت سے ناامید نہیں ہونا چاہئے ۔ خدا کی مدد شامل ہو تو بڑے بڑے متحیرالعقول واقعات ہو جاتے ہیں ۔ اب تم جا سکتے ہو ۔"

جب اسلم سلام کر کے رخصت ہونے لگا تو یاسمین نے بڑی نرمی سے کہا۔

" میں بھی ڈیڈی کے ساتھ آپ کی احسان مند ہوں کہ آپ نے میری جان بچانے کے لئے اتنی دلیری سے کام لیا ۔"

اسلم نے یاسمین کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے کہا ۔

" میں نے کسی پر بھی کوئی احسان نہیں کیا ۔ خدا حافظ "

اتنا کہہ کر اسلم کوٹھی کے گیٹ کی طرف چلنے لگا جہاں وارڈن اور بندوق بردار سپاہی کھڑا اس کا انتظار کر رہا تھا۔ جب وہ کوٹھی سے باہر نکل گئے تو جیلر صاحب نے یاسمین سے کہا ۔

" بڑا شریف لڑکا ہے ۔"

اتنا کہہ کر وہ اٹھے اور بولے ۔

" تم اگر چاہو تو یہاں آرام کر سکتی ہو ۔ تمہاری سہیلی آنے ہی والی ہو گی ۔ میں ذرا دفتر جا رہا ہوں ۔ "

" بہت اچھا ڈیڈی !"

جیلر چلا گیا۔ یاسمین وہیں بیٹھی اسلم کے بارے میں ہی سوچنے لگی ۔ اس کی آنکھوں کس میں بلا کی چمک اور کشش تھی ۔ جب وہ اسے غور سے دیکھ رہا تھا ' وہ قیدیوں کے لباس میں بھی

ایک کھاتے پیتے مہذب گھرانے کا نوجوان معلوم ہو رہا تھا - اس میں کوئی بات قیدیوں والی نہیں تھی - یاسمین کا دل چاہنے لگا کہ وہ ایک بار پھر اسلم کو دیکھے- اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اس کی مسحور کن باتیں سنے -

پھر اس کی سہیلی نجمی آ گئی - اس نے یاسمین کی خیریت پوچھی -

" شکریہ بہن ! اب تو اچھی ہوں -"

" خدا کا شکر ہے یاسمین کہ تم زندہ ہو ورنہ میں تو جیتے جی ہی مر گئی ہوتی - ذرا تصور تو کرو کہ میری پیاری سہیلی کو سانپ کاٹ لے- وہ مرجائے اور میں زندہ رہوں -

یاسمین نے آہستہ سے کہا -

" اگر وہ قیدی نوجوان میری مدد کو نہ آتا تو میں قبر کے اندر لیٹی ہوتی-"

" مائی گاڈ ! ایسی بات زبان پر نہ لاؤ یاسمین ! " نجمہ نے وحشت زدہ ہو کر کہا -

" ٹھیک کہہ رہی ہوں نجمی! اسلم نے میری جان بچائی ہے - "

نجمی نے حیرانی سے پوچھا-

" اسلم کون ؟"

" وہی قیدی -"

ساتھ ہی یاسمین شرما گئی اور چہرے پر سرخی دوڑ گئی - نجمی نے اس کا چہرہ ہاتھ سے اوپر اٹھا لیا- نجمی مسکرا رہی تھی -

" لیکن ایک قیدی سے محبت ہو جائے- یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی- "

" تم تو خواہ مخواہ مذاق کرنے لگیں - میں نے ایسی بات کب کہی تھی ؟"

یاسمین نے بڑی محبت سے نجمی کا ہاتھ جھٹکا اور آنکھیں بند کر کے منہ دوسری طرف کر لیا - نجمی نے قہقہہ لگایا اور اس کے بالوں پر ہاتھ پھیر کر بولی -

" مبارک ہو ---------- محبت اونچ نیچ سے آزاد ہوتی ہے -"

یاسمین اٹھ کر اندر بھاگ گئی - نجمی ہنستی ہوئی اس کے پیچھے گئی -

اس روز قیدیوں کو چھٹی دے دی گئی تھی اور وہ جیلر صاحب کی کوٹھی کے عقبی حصے میں کام پر نہیں آئے تھے- یاسمین رات کو کچھ دیر کے لئے اسلم کے بارے میں سوچتی رہی اور پھر سو گئی-

صبح سویرے قیدی کام پر آ گئے - ناشتے کے بعد جیلر صاحب دفتر چلے گئے - یاسمین نے ناشتہ کیا - کمرے میں لیٹی رسالے پڑھتی رہی - پھر اٹھی اور برآمدے میں آ کر کرسی پر نیم دراز ہو گئی - اسے قیدیوں کے پتھر توڑنے ' لکڑیاں چیرنے اور باتیں کرنے کی صاف آوازیں سنائی دے

رہی تھیں- وہ اٹھ کر کوٹھی کے لان میں ٹہلنے لگی- آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے اور ہلکی ہلکی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی- آج اسلم اینٹوں کے چبوترے پر نہیں بیٹھا تھا - اب اسے یہ بات غیر مہذب معلوم ہو رہی تھی کہ وہ چبوترے پر چڑھ کر بیٹھ جائے اور یاسمین کو کوٹھی کے برآمدے میں ٹہلتے یا لان میں بیڈ مٹن کھیلتے دیکھے - لان میں ایک جگہ گلاب کے پھولوں کی جھاڑیاں تھیں- یاسمین یہاں آ کر کھڑی ہو گئی- یہاں سے وہ قیدیوں کو دوسری جانب کام کرتے بھی صاف دیکھ سکتی تھی - اس نے اسلم کو بھی دیکھا - اسلم نے بھی دوسرے قیدیوں کی طرح جیل کے کپڑے پہن رکھے تھے اور وہ رجسٹر ہاتھ میں لئے ایک سٹول پر بیٹھا تھا اور اس میں کچھ لکھ رہا تھا - یاسمین کچھ دیر کھڑی اسے دیکھتی رہی - اچانک اسلم کی بھی ادھر نظر پڑ گئی- اس نے جب یاسمین کو گلاب کی جھاڑیوں کے پاس کھڑی دیکھا تو فوراً اسٹول پر سے اٹھ کر اس کے پاس آ گیا

" معاف کیجئے ! اب آپ کی طبیعت کیسی ہے ؟"

یاسمین اسلم کے اس بے باک اور جراء ت مندانہ رویے سے کچھ خوش بھی ہوئی اور کچھ گھبرا بھی گئی- اس نے شرما کر بظاہر بڑے اعتماد سے کہا -

" اب تو ٹھیک ہوں - صرف کلائی میں تھوڑا سا درد رہتا ہے- "

اسلم نے کہا -

" وہ بھی ٹھیک ہو جائے گا- آج موسم بڑا خوشگوار ہے -"

" جی ہاں - "

یاسمین کو محسوس ہوا کہ اسلم قیدیوں کی طرح نہیں ' بلکہ پڑھے لکھے لوگوں کے رومانس کرنے کے انداز میں باتیں کر رہا تھا- وہ سمجھ گئی کہ اسلم اسے پسند کرتا ہے اور اس سے تعلقات بڑھانے کی فکر میں ہے - یاسمین بھی اسلم کو پسند کرتی تھی لیکن وہ ایک خاص حد سے آگے تعلقات نہیں بڑھا سکتی تھی -

یاسمین نے مسکرا کر کہا -

" تو آپ قیدیوں کے داروغہ مقرر ہوئے ہیں ؟"

اسلم نے بھی مسکرا کر کہا -

" ایسا ہی معلوم ہوتا ہے -"

" ان لوگوں سے کام لینا تو بڑا مشکل ہوتا ہو گا -"

" ایسی بات نہیں ہے - دراصل ہم قیدیوں کا غلط تصور لئے ہوئے ہیں- قیدی بھی عام لوگوں کی طرح ہوتے ہیں - ان کی کمزوریاں ہوتی ہیں- وہ محبت بھی کرتے ہیں- نفرت بھی اور

دوسرے لوگوں کی طرح ان کے بھی بھائی بہن اور بیوی بچے ہوتے ہیں - اگر ان کی مناسب تربیت کی جائے تو یہ بھی اچھے شہری ہو سکتے ہیں۔"

"لیکن ڈیڈی تو کہا کرتے ہیں کہ بعض قیدی عادی مجرم ہوتے ہیں اور جیل سے رہا ہو کر پھر کوئی جرم کرتے ہیں اور دوبارہ قید ہو کر جیل میں آ جاتے ہیں۔"

"ان کی بات الگ ہے - ویسے انہیں بھی اگر بہتر ماحول میسر آ جائے تو پھر کبھی جرم نہ کریں- بہرحال یہ ایک بحث طلب مسئلہ ہے - اس میں آپ کو زیادہ دلچسپی نہیں لینی چاہئے- یہ کہیئے کہ اب آپ بیڈ مشن نہیں کھیلا کریں گی۔"

یاسمین مسکرائی- اس کے موتیوں ایسے دانت چمکنے لگے- "جی تو چاہتا ہے مگر ڈرتی ہوں کہیں پھر کوئی سانپ نہ کاٹ لے۔"

اسلم نے یاسمین کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا -

"آخر میں کس لئے یہاں ہوں- میرے ہوتے ہوئے سانپ آپ کا کچھ نہیں بگاڑ سکے گا-"

یاسمین نے شرما کر نظریں جھکا لیں- اس کا چہرہ سرخ ہو گیا- اس نے یونہی بات بدلنے کو کہا -

"کیا آپ کو سانپ کا زہر کڑوا نہیں لگا تھا؟"

"وہ تو شہد سے بھی زیادہ میٹھا تھا- "

یاسمین کے لئے اب وہاں کھڑا رہنا مشکل ہو گیا - اس نے اسلم کی طرف ایک نظر دیکھا اور "خدا حافظ" کہہ کر واپس چلی گئی- اسلم اسے جاتے ہوئے دیکھتا رہ گیا - جب وہ واپس قیدیوں میں آیا تو ہر ایک قیدی اسے رشک آمیز نگاہوں سے دیکھ رہا تھا مگر زبان سے کچھ نہیں کہہ سکتا تھا - کیونکہ وارڈن ان کے سر پر کھڑا تھا -

اس رات جب سب قیدی سو گئے تو اسلم نے کاغذ پنسل نکالی - موم بتی جلائی اور یاسمین کو خط لکھنے بیٹھ گیا - وہ یاسمین کی محبت کی آگ میں پھنک رہا تھا - محبت کے مخلص جذبات نے ہی اس پر یہ بات منکشف کر دی تھی کہ یاسمین بھی اسے پسند کرتی ہے مگر زبان سے اس کا اظہار نہیں کر سکتی - کیونکہ اسلم ایک قیدی ہے - اس کی سوشل پوزیشن وہ نہیں جیسی کہ محبت کے اظہار کے لئے ہونی چاہئے -

اس نے یاسمین کو لکھا -

خوبصورت لڑکی !

میں اس سے بہتر الفاظ میں تمہیں مخاطب نہیں کر سکتا کیونکہ میں جیل میں ہوں اور یہاں

اس سے بہتر خطاب مجھے نہیں مل سکا - یہ القاب اس لئے بھی موزوں ہے کہ تم واقعی خوبصورت ہو - اتنی خوبصورت کہ میں نے آج تک اپنی زندگی میں تم سے بڑھ کر حسین لڑکی کوئی نہیں دیکھی - میں قیدی ہوں - سات سال کی سزا بھگت رہا ہوں - چوتھا سال گزر رہا ہے - تین سالوں کی طویل مدت باقی ہے- مجھے کوئی حق نہیں پہنچتا کہ میں ایک شریف اور آزاد لڑکی سے محبت کا اظہار کروں مگر دل کے ہاتھوں مجبور ہوں- دل ------ جو صرف محبت کو جانتا ہے اور محبت ہی کی زبان سمجھتا ہے - جو دو محبت کرنے والوں کو ہی مقام پر ایک دوسرے کے بالمقابل لا کھڑا کر دیتا ہے- دل کی اپنی دنیا ہوتی ہے- اپنی زبان ہوتی ہے- اپنا کلچر ہوتا ہے اور اپنی مملکت ہوتی ہے- اس مملکت میں اس کا راج ہوتا ہے اور اسی کا حکم چلتا ہے - میں نے جب پہلے روز تمہیں دیکھا تو یاسمین جانتی ہو مجھے کیا محسوس ہوا تھا؟ مجھے یوں لگا تھا جیسے زمین پر آسمان کی قوس قزح اتر آئی ہے - جیسے دن کو چاند نکل آیا ہے - تم نے فیروزی قمیض پہن رکھی تھی - سفید دوپٹہ تم نے کمر کے گرد باندھا تھا - تم ہرنی کی طرح ادھر سے ادھر بھاگ رہی تھیں - میرے دل میں تمہاری محبت کی ایک سرپھلک لہرنے اپنے آپ جنم لیا اور دیکھتے دیکھتے وہ آسمانوں سے جا ٹکرائی- اب میں روز چبوترے پر بیٹھ جاتا - شام کو تم اپنی سہیلی کے ساتھ بیڈ مشن کھیلنے آتیں تو میں تمہیں چوری چوری ہی محبت بھری نگاہوں سے دیکھتا رہتا اور سرد آہیں بھرا کرتا - راتوں کو اپنی جیل کی کوٹھڑی میں لیٹ کر تمہارے نام کی مالا جپا کرتا - پھر ایک روز تم گیند اٹھانے جھاڑیوں کے پاس آئیں - میں نے تمہیں ذرا قریب سے دیکھا - تمہارے ماتھے پر پسینے کے موتی جھلملا رہے تھے - تم نے بھی ایک نظر مجھے دیکھا لیکن جلدی سے بھاگ گئیں- میرے خدا! وہ کیا نظر تھی - میں اس کا تصور کرتا ہوں- تو اب بھی کانپ اٹھتا ہوں -

ایک دن ایسا ہوا کہ گیند ہماری طرف اچھل کر آن گرا - تم گیند لینے جھاڑیوں کے پاس آ کر کھڑی ہو گئیں - میں نے گیند اٹھا کر تمہیں دیا تو میری انگلیاں تمہاری انگلیوں سے چھو گئیں - مجھے یوں لگا جیسے میں نے آسمان کو ہاتھ لگا دیا ہو - جیسے ستاروں کو اپنی مٹھی میں بند کر لیا ہو - مجھ پر نشے کی کیفیت طاری ہو گئی - تمہارا چہرہ گرمی میں تازہ گلاب کی طرح کھل رہا ہے اور اس پر پسینے کے قطرے شبنم کی طرح چمک رہے تھے - اس رات میں بالکل نہ سو سکا - رات بھر اپنے پھونس کے بستر پر کروٹیں بدلتا رہا - دل بار بار کہتا - ارے دیوانے! تو کس سے محبت کر رہا ہے - تو قیدی اور وہ ایک اونچے گھرانے کی لڑکی! تمہارا اور یاسمین کا کیا ساتھ! لیکن یاسمین! میں سدا سے قیدی نہیں ہوں - کبھی میں بھی ایک اونچے گھرانے کا چشم و چراغ تھا - بہرحال یہ ایک لمبی کہانی ہے- تم اسے سن کر کیا کرو گی - اس کے بعد وہ میری زندگی کا سب سے خوبصورت اور خوفناک دن آیا- جب میں نے جھاڑیوں میں تمہاری چیخ کی آواز سنی- تمہیں سانپ نے ڈس لیا

تھا - میری آنکھوں تلے اندھیرا چھا گیا - مجھے صرف تمہاری چیخ کے اور کچھ سنائی نہیں دے رہا تھا- نہ جانے کون سی پراسرار قوت کے تحت میں چھلانگ لگا کر لان میں کود گیا- اور میں نے تمہاری کلائی پر منہ رکھ کر سانپ کا زہر چوسنا شروع کر دیا- میں زہر کو یوں چوس رہا تھا جیسے وہ زہر نہ ہو بلکہ آب حیات ہو اور یاسمین! زہر تمہارے خون میں شامل ہو کر زہر کہاں رہا تھا- وہ تو حقیقتاً آب حیات میں ہی تبدیل ہو چکا تھا - اس آب حیات نے تمہاری بھی جان بچا لی اور مجھے بھی حیات جاودانی بخش دی -

میرے ہونٹ تمہاری کلائی کے زخم پر نہیں تھے بلکہ دھرتی کے سینے سے لگے اس کا رس چوس رہے تھے - میں زندگی بھر اس لمحے کی خوبصورتی ' شیرینی اور دلکشی کو فراموش نہیں کر سکتا - وہ لمحہ گزر گیا مگر میں ابھی تک اسی عالم میں ہوں - یوں معلوم ہوتا ہے کہ سانپ کا زہر مجھ میں سرایت کر گیا ہے - یہ محبت کے سانپ کا زہر ہے جس کا توڑ آج تک دریافت نہیں ہو سکا - تم اچھی ہو گئی ہو - مگر میں اب سدا بیمار رہوں گا- میں کبھی اچھا نہیں ہو سکتا - یہ زہر اب میری جان لے کر ہی رہے گا - یہ روگ مجھے ختم کر کے ہی دم لے گا -

میں نے جس عورت سے پہلا پیار کیا ' وہ ایک آوارہ اور بدچلن عورت تھی - اس نے پہلے مجھے اپنی محبت کا بھرپور یقین دلایا لیکن پھر میری آنکھوں کے سامنے کسی دوسرے آدمی کے ساتھ رنگ رلیاں منانے لگی - اس پر ہی نہیں بلکہ اس نے مجھے اشتعال دلایا - مجھے طعنے دیئے اور مجھے مجبور کیا کہ میں اس پر حملہ کر دوں- اور میں نے محبت کی ناکامی میں پاگل ہو کر اس پر حملہ کر دیا - وہ بچ گئی - اس کا ساتھی زخمی ہو گیا اور میں قید ہو کر جیل میں آ گیا - کاش ! وہ کوئی شریف اور باوفا عورت ہوتی ! پھر وہ دیکھتی کہ اسلم اسے محبت کی کن بلندیوں پر پہنچا دیتا ہے اور کس طرح اس کے قدموں پر اپنے دل کی دولت نچھاور کر دیتا ہے - لیکن وہ دولت کی----- دنیاوی دولت کی ' سیم و زر کی دیوانی تھی - اسے محبت نہیں ' سونا چاہئے تھا - دل نہیں ' کار ' کوٹھی اور کلب کی عیاشانہ زندگی کی خواہش تھی - چنانچہ اس قسم کی زندگی کا جو انجام ہوا کرتا ہے ' وہ ہو کے رہا -

مگر تمہیں پا کر میں نے اپنی زندگی کی کھوئی ہوئی منزل کا پھر سے نشان پا لیا ہے - تم میری زندگی کا محور ہو یاسمین! تمہارے وجود میں مجھے میری زندگی کے سارے سکھ مل گئے ہیں - اب مجھے اپنی زندگی بے معنی اور بے مقصد معلوم نہیں ہو رہی - اب میرا سینہ نئے ارادوں اور عزائم سے پر ہو گیا ہے- اب مجھے زندگی اتنی ڈراؤنی اور بھیانک دکھائی نہیں دے رہی - اب میں زندگی کے اس کھیل میں نئے سرے سے بڑھ چڑھ کر حصہ لوں گا - اب جو اس کھیل کا نیا پردہ اٹھا ہے تو میں اپنی آنکھوں کے سامنے ایک بالکل ہی نیا اور زندگی سے بھرپور منظر دیکھ رہا ہوں-

لکھ بھی رہا ہوں اور سوچ بھی رہا ہوں کہ اس خط کا تم پر کیا اثر ہو گا - ہو سکتا ہے تم اس خط کو پڑھ کر ناراض ہو جاؤ - اسے پھاڑ کر آتش دان میں پھینک دو اور مجھ سے پھر کبھی بات نہ کرو- یہ بھی ہو سکتا ہے کہ تم اسے اپنے محترم والد کو دکھا دو اور کہو کہ دیکھو اس شخص نے ہماری مہربانیوں کا یہ ثمر دیا ہے - لیکن یاسمین ! میں ان تمام نتائج سے بے نیاز ہو کر تمہیں خط لکھ رہا ہوں -

میرے دل میں اس وقت اگر کوئی جذبہ ہے تو صرف تمہاری محبت اور تمہارے پیار کا جذبہ ہے اور کچھ نہیں - میں صرف اتنا جانتا ہوں کہ میں تم سے محبت کرتا ہوں - یہ بات میں تمہیں خط میں بھی لکھ رہا ہوں - یہی بات میں تم سے چھپ کر بھی کہہ سکتا ہوں اور یہی بات میں پھانسی کے تختے پر کھڑے ہو کر بھی کہہ سکتا ہوں - کہتے ہیں محبت اندھی ہوتی ہے' بہری ہوتی ہے مگر یاسمین ! میری محبت اندھی نہیں ' بہری نہیں ' گونگی نہیں-

وہ دیکھتی ہے مگر صرف اپنے ہی محبوب کے چہرے کو ------ سنتی ہے مگر صرف محبوب کی آواز کو ------! اگر تمہیں مجھ سے محبت نہ بھی ہو تو کوئی بات نہیں - میری محبت معاوضہ نہیں چاہتی - میں بھی صرف محبت کرتا ہوں- اس کے جواب میں محبت نہیں چاہتا- تم مجھ سے نفرت بھی کرو گی تو میں تم سے محبت ہی کرتا رہوں گا- کیونکہ میری محبت نفرت کے نام سے ناواقف ہے- میری محبت تو سورج مکھی کا پھول ہے جو سورج نہ بھی نکلے تو اپنا چہرہ سورج ہی کی طرف کیے رکھتا ہے- میں تم سے محبت کرتا ہوں یاسمین! جس طرح چکور چاند سے محبت کرتا ہے- حالانکہ جب سے دنیا عالم وجود میں آئی ہے ' وہ کبھی چاند سے ایک بار ملاقات نہیں کر سکا - میں محبت کرتا ہوں اس طرح جس طرح نہر کے دو کنارے ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں - وہ کبھی ایک دوسرے سے نہیں ملتے ' لیکن اس کے باوجود پانی کی لہریں ان کے محبت بھرے پیغام ایک دوسرے تک پہنچاتے رہتے ہیں - میں تم سے اسی طرح پیار کرتا ہوں جس طرح پہاڑ کی برف آلود چوٹیاں اپنی وادیوں سے پیار کرتی ہیں - ان کا آکاش اور پاتال کا رشتہ ہوتا ہے - پھر بھی وہ سدا ایک دوسرے کو دیکھتے رہتے ہیں - اب الوداع یاسمین! اگر تم نے اس خط کے جواب کی ضرورت محسوس کی تو مجھے چبوترے پر اس کا جواب پہنچا دینا - بے حد محبت اور نیک تمناؤں اور خوبصورت ترین خیالات کے ساتھ

میں ہوں ہمیشہ ہمیشہ کے واسطے تمہارا

اسلم

قیدی نمبر ۲۱۱۵

خط لکھ کر اسلم نے اسے ایک بار غور سے پڑھا - تہہ کر کے جیب میں رکھا اور سونے کی

کوشش کرنے لگا - اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے اس کا بوجھ ہلکا ہو گیا ہے- اسے اپنا ایک آپ ایک ابرپارے کی طرح محسوس ہو رہا تھا جو بہار کے نیلے آسمان پر ہلکی ہوا میں بہا چلا جا رہا ہو - جس کے اوپر نیلگوں آسمان کی بلندیاں ہوں اور نیچے وسیع و عریض پھولوں بھری شاداب وادی کا سلسلہ پھیلا ہو -

صبح جب وہ دوسرے قیدیوں کے ساتھ کام پر گیا تو بڑی بے تابی سے یاسمین کا انتظار کرنے لگا - مگر وہ کوٹھی سے باہر نہیں آ رہی تھی - دوپہر ہو گئی - پھر چار بج گئے - کام ختم کرنے میں دو گھنٹے باقی رہ گئے - اسلم بار بار کوٹھی کے لان میں جھانک کر دیکھ لیتا لیکن یاسمین دکھائی نہیں دے رہی تھی - پھر اچانک اس نے یاسمین کو دیکھا- اسلم کا دل خوشی سے دھڑکنے لگا- یاسمین برآمدے میں کرسی کھینچ رہی تھی - اس کے ہاتھ میں کوئی کتاب تھی -

اس نے اسلم کو دیکھا اور تھوڑا سا مسکرائی - اسلم وہیں کھڑا رہا - پھر جانے کیسے اسلم نے ہاتھ کے اشارے سے اسے اپنی طرف بلا لیا - یاسمین برآمدے کی سیڑھیاں اتر کر لان میں سے گزرتی اس کے پاس آ کر کھڑی ہو گئی - وہ بھی حیران سی ہو رہی تھی کہ اسلم نے اسے کس لئے بلایا ہے - اسلم نے آہستہ سے کہا -

" تکلیف کی معافی چاہتا ہوں لیکن میں تمہارے لئے کچھ لایا ہوں- "

یاسمین نے مسکرا کر پوچھا -

" کیا ؟"

" خط - "

یاسمین نے بھولپن سے پوچھا -

" کس کا خط ؟"

" پڑھ لینا - "

اس کے ساتھ ہی اسلم نے جیب سے خط نکال کر یاسمین کو دے دیا اور چپکے سے واپس آ گیا - یاسمین خط لے کر گھبرا سی گئی - اس نے چاروں طرف دیکھ کر اطمینان کر لیا کہ وہاں کوئی نہیں پھر فوراً خط کو قمیض کے اندر چھپایا اور تیز تیز قدم اٹھاتی کوٹھی کے اندر چلی گئی - اسلم نے جب دیکھا کہ وہ خط لیکر واپس چلی گئی ہے تو اسے تسلی ہو گئی -

یاسمین نے اپنے کمرے میں جا کر دروازہ بند کیا اور دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ خط کھولا - وہ جانتی تھی کہ اسلم نے اسے ایک محبت نامہ لکھا ہو گا لیکن پھر بھی اس کا جی یوں دھڑک رہا تھا جیسے کچھ معلوم نہ ہو کہ اس خط میں کیا لکھا ہے - جوں جوں وہ خط پڑھتی جا رہی تھی - اس کا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا اور کان گرم ہو کر دہکنے لگے تھے - وہ پلنگ پر بیٹھ گئی - پھر اٹھ کر

صوفے پر آن بیٹھی - جب پورا خط پڑھ چکی تو اس کی آنکھیں بند تھیں اور سر صوفے کی پشت پر لگا تھا - اس کے دل و دماغ پر ایک نشے کی کیفیت طاری تھی - محبت وہ بھی کر رہی تھی لیکن اتنی شدت سے نہیں جتنی شدت سے اسلم اس سے کر رہا تھا -

وہ رات اسلم نے بڑی بے چینی سے گزاری- صبح ہوئی- اسلم امیدوں بھرے دل کے ساتھ کوٹھی کی طرف روانہ ہوا- اسے معلوم تھا کہ یا تو یاسمین اسے سرزنش کرے گی کہ آئندہ ایسی جراءت کبھی نہ کرے اور یا اس نے اپنے ڈیڈی کو بتا دیا ہو گا اور وہ اندر بلا کر اس کی زبردست بے عزتی کریں گے اور شام تک اسے کسی دوسری جیل میں تبدیل کر دیا جائے گا --- بہرحال وہ ہر قسم کے انجام کے لئے تیار تھا - اس نے تیر کمان سے چھوڑ دیا تھا-

اس روز بھی یاسمین لان میں یا برآمدے میں نظر نہ آئی - اسلم کی بے چینی میں وقت کے ساتھ ساتھ اضافہ ہو رہا تھا- اچانک یاسمین برآمدے میں نکلی - آج اس نے سفید کپڑے پہن رکھے تھے اور وہ دور سے ایک دیوی معلوم ہو رہی تھی جو پوجا کی تیاری کر رہی ہو- اس نے دور سے اسلم کو دیکھا - اسلم کا دل دھڑ دھڑ کرنے لگا - اس طالب علم کی طرح جو شب و روز کی محنت کے بعد امتحان کے نتیجے کا اعلان سننے والا ہو - یاسمین نے ادھر ادھر دیکھا اور چپکے سے قدم قدم چلتی لان میں آئی- لان میں کچھ دیر ادھر ادھر ٹہلتی رہی - پھر جھاڑیوں کے پاس آئی- اور مٹھی میں دبایا ہوا ایک رقعہ اسلم کی طرف اچھال دیا- رقعہ زمین پر پڑا تھا اور اسلم اسے اٹھاتے ہوئے گھبرا رہا تھا- کیا خبر اس میں کیا لکھا ہوا ہو ؟ پھر اس نے لپک کر رقعہ اٹھا لیا اور فوراً جیب میں رکھ لیا - اس کے بعد وہ دوسرے قیدیوں کے پاس آ گیا - یہ جگہ جہاں وہ یاسمین سے باتیں کیا کرتا تھا - ان کی اوٹ میں تھی اور وہاں اسے کوئی نہیں دیکھ سکتا تھا- قیدیوں کے پاس آ کر ادھر ادھر کی باتیں کرتا رہا - انہیں کام کرتا دیکھتا رہا-

وارڈن ذرا پرے درخت کے نیچے چارپائی پر لیٹا حقہ پی رہا تھا - اپنے دل کے چور کا خوف دور کرنے کے لئے ہی اسلم وارڈن کے پاس چلا گیا- کچھ بے معنی باتیں کیں اور سب کی نظریں بچا کر ایک جھاڑی کے پیچھے جا کر کھڑا ہو گیا- جیب سے یاسمین کا رقعہ نکالا- رقعہ مختصر سا تھا اور پنسل سے لکیردار کاغذ پر لکھا گیا تھا - رقعہ بغیر کسی القاب کے شروع ہوتا تھا - اور نیچے بھی یاسمین کا نام درج نہیں تھا -

" ایک گھنٹے کے بعد کوٹھی کے پچھلے دروازے سے اندر آ جانا - کونے والا دروازہ کھلا ہو گا- اس خط کو ساتھ لیتے آنا - میں زیادہ نہیں لکھ سکتی - اتنا بھی صرف تمہاری محبت کی خاطر لکھ رہی ہوں- "

اسلم کا دل خوشی سے اچھل پڑا تو یاسمین بھی مجھ سے محبت کرتی ہے - میرے خدا ! میں

کس قدر خوش نصیب ہوں۔ کہ مجھے میری کھوئی ہوئی محبت پھر سے مل گئی۔ اس نے رقعہ تہہ کر کے جیب میں رکھا اور وارڈن سے جا کر وقت پوچھا۔ گھنٹہ بھر وہ بے تابی سے قیدیوں میں گھوم پھر کر ان کا کام دیکھتا رہا۔ کچھ دیر بڑی خندہ پیشانی سے وارڈن سے باتیں کیں۔ تھوڑی سی گفتگو بندوق بردار سپاہی سے کی۔ جب پورا ایک گھنٹہ گزر گیا تو آہستہ آہستہ وہاں سے کھسک کر کوٹھی کے عقبی حصے کی جانب آ گیا۔ یہاں وہ بند دروازے کے اوپر سے ہو کر ترکاریوں کی کیاری میں سے ہو کر برآمدے کے کونے والے دروازے تک جا پہنچا۔ دروازہ تھوڑا سا کھلا ہوا تھا۔ اس نے آہستہ سے دروازہ کھول دیا اور ایک نظر چاروں طرف دیکھ کر اندر داخل ہو گیا۔

اندر داخل ہوتے ہی وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ ----- یاسمین اس کے کھڑی مسکرا رہی تھی۔ اسلم کو یوں لگا جیسے رات کے اندھیرے میں اچانک سورج کی سنہری کرنیں جگمگا اٹھی ہوں۔ وہ یہ تصور ہی نہیں کر سکتا تھا کہ یاسمین اسے مسکراتی ہوئی ملے گی۔

"دروازہ بند کر دو اسلم!"

یاسمین کے منہ سے اپنا نام سن کر اسلم جھوم گیا۔ یاسمین نے دبی زبان سے کہا۔

"شور مت کرنا اگرچہ گھر میں کوئی نہیں لیکن احتیاط ضروری ہے۔ ادھر آ کر بیٹھ جاؤ۔"

اسلم صوفے پر بیٹھ گیا۔ یاسمین بھی اس کے پاس ہی صوفے پر بیٹھ گئی۔ کچھ دیر خاموشی طاری رہی۔ یاسمین نے ہمت کر کے بلا تو لیا تھا لیکن اب شرم سے پانی پانی ہوئی جا رہی تھی۔ اسلم نے آہستہ سے کہا۔

"تم نے میرے خط کا برا تو نہیں مانا یاسمین؟"

یاسمین نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس کا سر جھکا ہوا تھا۔ اسلم نے اپنا جملہ دھرایا۔ یاسمین نے سر ہلا کر کہا۔

"نہیں"

اسلم نے یاسمین کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔

"تم ------ تم اندازہ نہیں کر سکتیں یاسمین کہ میں تم سے کس قدر محبت کرتا ہوں۔ سوچتا ہوں اس محبت کا انجام کیا ہو گا؟ لیکن انجام سے بے خبر ہوں۔ دل بار بار تمہارا نام لیتا ہے۔ آنکھوں بار بار تمہیں تلاش کرتی ہیں۔ انگلیاں تمہارا نام لے کر تمہاری طرف بلند ہوتی ہیں۔ تمہیں تلاش کرتی ہیں۔ تمہیں ٹٹولتی ہیں یاسمین۔ کیا تم بھی مجھ سے محبت کرتی ہو؟"

یاسمین نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ ایک دم چھوئی موئی سی بن گئی تھی۔ اسلم نے یاسمین کا ہاتھ دبایا۔ یاسمین نے بھی ہاتھ کھینچنا چاہا۔ اسلن نے اسے مضبوطی سے پکڑ لیا۔

اب تم اس ہاتھ کو مجھ سے جدا نہ کر سکو گی۔ یہ ہاتھ میری زندگی کا سب سے بڑا مقصد

بن گیا ہے یاسمین! بولو! کیا تم بھی مجھ سے اسی طرح پیار کرتی ہو؟ کیا تمہیں زندگی کی کسی منزل کسی مرحلے پر پچھتاوا تو نہیں ہو گا۔ کیا تم بھی مجھ سے محبت کرتی ہو۔ اسی طرح جس طرح میں تم سے محبت کر رہا ہوں۔"

یاسمین نے پلکیں اٹھا کر اسلم کو دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں محبت کی گہری گہری لہریں اٹھ رہی تھیں۔ وہ سفید کپڑوں میں بلا کی حسین معلوم ہو رہی تھی۔ اس نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر کہا۔

"اگر ایسی بات نہ ہوتی تو میں تمہیں یہاں بھی کیوں بلاتی؟"

اسلم نے بے اختیار ہو کر یاسمین کا ہاتھ چوم لیا۔

"میری جان! میری یاسمن! میں دنیا کا خوش قسمت ترین انسان ہوں۔ مجھے تمہاری محبت مل گئی ہے۔ مجھے اور کیا چاہئے۔ تم نے میرے کوزے میں دریا بند کر دیا ہے۔ ڈرتا ہوں کہیں چھلک نہ جاؤں۔ اتنی خوشی مجھ سے کیسے برداشت ہو گی"

یاسمین نے مسکرا کر پوچھا۔

"میرا خط"

اسلم نے جیب سے رقعہ نکال کر اسے چوما اور یاسمین کی طرف بڑھا کر کہا۔

"کوئی شخص ہاتھ میں آیا ہوا چاند واپس نہیں کر سکتا مگر تمہارا حکم ہے۔ اس لئے انکار کی بھی جراءت نہیں کر سکتا۔"

یاسمین نے رقعہ لے کر پھاڑ ڈالا۔

"میں خود بھی تم سے رقعہ نہیں لینا چاہتی تھی۔ پر کیا کروں۔ جانتی ہوں کہ تم جیل میں رہتے ہو۔ اس کی مناسب حفاظت نہ کر سکو گے۔"

"کاش میں آزاد ہوتا۔ آزاد --- تمہیں پیار کرنے، تمہارا نام لینے کو آزاد۔"

"ڈیڈی تمہاری بہت تعریف کیا کرتے ہیں۔ سچ وہ تم سے بے حد متاثر ہیں۔ کہا کرتے ہیں کہ اسلم بڑا اچھا لڑکا ہے اور بڑے اعلیٰ خاندان سے تعلق رکھتا ہے۔ وہ تو تمہاری باقی سزا کو معاف کروانے کی فکر میں ہیں۔ میرا خیال ہے انہوں نے ادھر لکھ بھی دیا ہے۔"

اسلم بولا۔

"میں خود ان کی بڑی عزت کرتا ہوں۔ وہ بے انتہا شریف، نیک دل اور دیانت دار اور رحمدل آدمی ہیں۔ یہ میری خوش قسمتی کہ وہ مجھ کو اچھا سمجھتے ہیں اور میری رہائی کی بھی کوشش کر رہے ہیں۔"

"لیکن اسلم! تم آزاد ہو گئے تو پھر تم کو مجھ سے ملنے کی کیا ضرورت ہو گی؟"

اسلم نے یاسمین کا ہاتھ تھام کر کہا -

" محبت اپنے آپ ایک بہت بڑی ضرورت ہوتی ہے - محبت ہمیشہ زندہ رہتی ہے - ہر ماحول میں زندہ و پائندہ رہتی ہے - جب وہ ایک بار جنم لے لیتی ہے تو پھر کبھی فنا نہیں ہوتی - میں تم سے دل کی گہرائیوں سے محبت کرتا ہوں اور مرنے کے بعد بھی اگر دوسرا جنم ہوا تو صرف تمہیں ہی تلاش کروں گا اور تم سے ہی محبت کروں گا - "

اس کے ساتھ ہی اسلم نے یاسمین کا سر اپنے دونوں ہاتھوں میں تھام لیا اور بڑی محبت ' عقیدت اور تقدس سے اسے اپنی طرف لا کر اس کے خوبصورت ' شبنمی ' سرخ ہونٹوں پر محبت کا پہلا بوسہ ثبت کر دیا - یاسمین نے شرما کر سر جھکا لیا - اسلم نے اسکا سر اپنے سینے سے لگا لیا - "

اچانک دوسرے کمرے میں آہٹ ہوئی - یوں لگا جیسے میز پر سے کوئی چیز فرش پر گر پڑی ہو - یاسمین اچھل کر اسلم کی آغوش سے نکلی اور اس کے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر دوسرے کمرے میں بھاگ گئی - تھوڑی دیر بعد واپس آئی - دروازہ اندر سے بند کیا اور اسلم کے پاس آ کر بیٹھ گئی -

" کون تھا ؟ "

" کوئی نہیں - خادمہ نے ایش ٹرے گرا دیا تھا - "

" کیا ٹوٹ گیا ؟ "

یاسمین نے مسکرا کر کہا -

" ہاں ----- کوئی بات نہیں - "

اسلم نے کہا -

" یاسمین کسی روز اسی طرح میرا دل بھی توڑ کر تم یہ نہیں کہہ دو گی ------- کوئی بات نہیں - "

یاسمین نے اسلم کی طرف دیکھ کر کہا -

" ایسا کبھی نہیں ہو گا ؟ "

" سچ کہہ رہی ہو ؟ "

" بالکل سچ - "

اسلم نے بے اختیار ہو کر یاسمین کو اپنے ساتھ لگا لیا - یاسمین سمٹ سی گئی - اس کا سانس تیز تیز چلنے لگا -

" خدا کے لئے کوئی آ نہ جائے - میں بہت ڈرتی ہوں - "

اسلم نے یاسمین کا منہ چوم کر کہا -

" یاسمین میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں - بس میں تمہیں اپنی بیوی بنا کر اپنا ایک

خوبصورت گھر بسانا چاہتا ہوں - میں تمہارے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا - مجھے میری محبت ہی نہیں بلکہ اپنی زندگی کی ساتھی عورت مل گئی ہے - "

یاسمین نے آہستہ سے کہا -

" یہ کیسے ہو سکتا ہے ؟ "

" کیا تم تیار ہو ؟ "

" اگر تیار بھی ہو جاؤں تو جب تک میرے ڈیڈی راضی نہ ہوں گے ' میں کیا کر سکتی ہوں ؟ "

" ٹھیک ہے - ایسا ہی ہونا چاہئے - تمہارے ڈیڈی ضرور راضی ہو جائیں گے - میں ان پر ثابت کر دوں گا کہ یاسمین کا میں سب سے زیادہ مستحق ہوں اور میں اسے زیادہ سے زیادہ ہی خوش رکھ سکوں گا - میں اس کی خوشی کی خاطر اپنی جان کی بازی بھی لگا سکتا ہوں اور اس کا ثبوت انہوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا ہے - "

یاسمین نے ہلکی سی آہ بھر کر کہا -

" کاش ! ایسا ہو جائے - یوں لگتا ہے جیسے میں بھی اب تمہارے بغیر زندہ نہ رہ سکوں گی - تم سے زیادہ ہمدرد اور دکھ درد میں ساتھ دینے والا مجھے اس دنیا میں اور کہیں نہ مل سکے گا - کاش ! میرے ڈیڈی مان جائیں - "

" تم انہیں صاف صاف کہہ دو گی کہ تم اسلم سے شادی کرنے پر تیار ہو ؟ "

" اگر ایسا وقت آیا تو میں ضرور کہہ دوں گی - "

اسلم نے یاسمین کا منہ چوم لیا اور پیار سے اس کے بالوں پر ہاتھ پھیرنے لگا - اس کے بال ملائم تھے اور بالکل ریشم کے لچھے محسوس ہو رہے تھے - اچانک یاسمین نے گھڑی دیکھی اور کہا -

" اب تم جاؤ اسلم ! ڈیڈی کے گھر آنے کا وقت ہو رہا ہے - "

" پھر کب ملو گی یاسمین ؟ "

" میں تمہیں خط لکھ دوں گی تم فکر نہ کرو - "

" خدا حافظ "

" خدا حافظ "

اسلم نے جاتے ہوئے یاسمین کو اپنے ساتھ لگا کر کئی بار چوما اور دروازہ کھول کر باہر نکل گیا - برآمدے سے نکل کر وہ ترکاری کی کیاری میں سے ہو کر بند دروازے کو پھلانگ کر دوسری طرف نکل گیا - وہاں قیدی بدستور اپنے کام میں لگے تھے - اور وارڈن گہری نیند میں سو رہا تھا -

طرف سپاہی چل پھر کر پہرہ دے رہا تھا۔ اسلم کی عدم موجودگی کو کسی نے محسوس نہ کیا تھا۔ وہ چبوترے کے پاس آ کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے دیکھا کہ یاسمین برآمدے میں کھڑی ہے۔ اسلم نے اس کی طرف دیکھ کر ہاتھ ہلایا۔ یاسمین ہاتھ ہلا کر مسکرائی اور جلدی سے اندر بھاگ گئی۔
آج ساری کائنات کی خوشیاں اسلم کے قدموں میں ڈھیر تھیں۔

حیات اک مستقل غم کے سوا کچھ بھی نہیں شاید
خوشی بھی یاد آتی ہے تو آنسو بن کے آتی ہے

ٹھیکیدارنی کے ہاں بد نصیب سلمہ بڑی مصیبت کے دن بسر کر رہی تھی۔ جوان اور کنواری لڑکی جب گھر سے بے گھر ہو جائے تو ہمارے ہاں اس کا ٹھکانہ یا تو بدمعاش لوگوں میں ہوتا ہے۔ جن کے وہ ہتھے چڑھ جائے اور یا اس خاوند کے ہاں جس سے وہ شادی کر لے۔ تیسرا راستہ کوئی نہیں ہوتا۔ سلمہ تیسرے راستے پر چلنے کی کوشش کر رہی تھی مگر اسے ہر قدم پر لاکھوں دشواریوں کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔ وہ جوان تھی۔ شباب اپنے جوبن پر تھا۔ خوبصورت تھی اور اچھے ماحول میں بڑھی پلی تھی۔ اس کے خدوخال میں دل کشی اور جاذبیت تھی جس کو بھرپور جوانی نے اور بھی دلکش اور پرکشش بنا دیا تھا۔ جو بھی اسے دیکھتا اس پر عاشق ہو جاتا اور اسے کسی طرح اپنے دام تزویر میں پھنسانے کی کوشش کرتا۔ سلمہ گھر سے کبھی باہر نہیں نکلی تھی۔ مگر گھر کی چاردیواری میں رہ کر بھی اسے چین نصیب نہیں تھا۔ کیونکہ یہ گھر اس کا اپنا نہیں تھا۔ ایک ملازمہ کی بھی حیثیت ہی کیا ہوتی ہے۔ ویسے تو ٹھیکیدار کے بچوں کو پڑھاتی تھی۔ لیکن گھر میں سب کام لئے جاتے تھے۔ کھانا وہ پکاتی۔ کیونکہ ٹھیکیدارنی کو اس کے ہاتھ کا پکا ہوا سالن بہت پسند تھا۔ کمرے وہ دھوتی۔ کمروں کی صفائی وہ کرتی۔ بچوں کو نہلا دھلا کر سکول وہ روانہ کرتی۔
قیامت یہ ہوئی کہ ٹھیکیدار صاحب کی نظر عنایت بھی سلمہ پر پڑنے لگی۔ بدوضع بھدے ٹھیکیدار نے ایک روز شراب کے نشے میں سلمہ کو دیکھا تو اسے محسوس ہوا کہ اس کے اپنے گھر میں گنگا بہہ رہی ہے۔ سلمہ جوان اور خوبصورت ہے۔ ٹھیکیدار نے سلمہ سے چکنی چپڑی باتیں کرنا شروع کر دیں۔ وہ گھور گھور کر اس کے جسم کا جائزہ لینے لگا۔ اسے بڑی ملائمت سے مخاطب کرتا۔ اور یوں ہی کمرے میں بلوا کر بچوں کی پڑھائی کی باتیں پوچھا کرتا۔ سلمہ بھی ٹھیکیدار کی نیت سے آگاہ ہو گئی تھی۔ جس طرح سچی محبت دوسرے پر دل کا حال اندر ہی اندر کھول دیتی ہے۔ اسی طرح ہوس رانی بھی دوسرے کو سب کچھ بتا دیتی ہے۔ سلمہ ٹھیکیدار سے بات کرتے گھبرایا کرتی۔ مگر وہ مجبور تھی کہ اس شخص کی باتیں توجہ سے سنے اور پھر انکا جواب دے۔ کیونکہ وہ

اس کی نوکرانی تھی۔ اس سے تنخواہ لیتی تھی۔ وہ جب چاہے اسے گھر سے نکال سکتا تھا اور گھر سے نکل کر سلمہ کے سامنے سوائے دربدر کی ٹھوکروں کے اور کوئی ٹھکانہ نہیں تھا۔
سرما کا موسم شروع ہو چکا تھا۔ خاصی سردی پڑنے لگی تھی۔ ٹھیکیدار کو علم تھا کہ رشید سلمہ کو تنگ کیا کرتا تھا۔ اس نے رشید کا آنا جانا بالکل بند کروا دیا تھا اور سلمہ کی ہمدردیاں حاصل کرنے کی خاطر اسے کہا بھی تھا کہ وہ کوئی فکر نہ کرے۔ اس کے ہوتے ہوئے اس گھر میں کوئی کچھ نہیں کہہ سکتا۔ لیکن یہ لومڑ کے منہ سے نکل کر ریچھ کے پنجے میں پھنسنے والی بات تھی۔ سلمہ خاموش ہو رہی۔ وہ سوائے خاموش رہنے کے اور خاموشی سے سب کچھ سہہ جانے کے اور کچھ نہیں کر سکتی تھی۔ ایک روز سلمہ رات کا کام ختم کر کے اپنی کوٹھری کی طرف جا رہی تھی کہ سیڑھیوں میں سامنے سے ٹھیکیدار آتا ہوا مل گیا۔ سلمہ سیڑھیوں میں ایک طرف ہٹ گئی۔ ٹھیکیدار نے قریب آ کر مسکرا کر کہا۔
"تم نے اتنی میلی قمیض کیوں پہن رکھی ہے؟ کیا تمہارے پاس اور کوئی قمیض نہیں؟ اچھا کل میں تمہیں کپڑا لا کر دوں گا۔"
اس دوران ٹھیکیدار سلمہ کے شانے پر ہاتھ پھیرتا رہا۔ پھر اس نے سلمہ کو بازوؤں میں لے کر چومنے کی کوشش کی۔ سلمہ کو یوں لگا جیسے وہ کسی ریچھ کی آغوش میں گری جا رہی ہے۔ اس نے تھوڑی سی مدافعت کے بعد اپنے آپ کو آزاد کرا لیا اور سیڑھیوں پر سے لرزتی ہوئی نیچے اتر گئی۔ اپنی کوٹھڑی میں جا کر وہ کتنی ہی دیر پلنگ پر لیٹی روتی رہی۔
دوسرے روز سچ مچ ٹھیکیدار سلمہ کے لئے قمیض کا ریشمی ٹکڑا لے آیا۔ اس نے کوٹھڑی میں آ کر یہ کپڑا سلمہ کے پلنگ پر رکھ دیا اور کہنے لگا۔
"تم بھاگ کیوں گئیں؟ کیا میں کوئی غیر ہوں؟ یہ کپڑا میں تمہارے لئے لایا ہوں۔ تم اس کی قمیض بنوا لینا۔ ہمارے تمہارے پیسے کیا دو ہیں؟ آخر تم مجھ سے شرماتی کیوں ہو؟ کیا میں نے تم پر بری نظر رکھی ہوئی ہے؟ بالکل نہیں۔ میں تو بس تم سے پیار کرتا ہوں۔ جس طرح لوگ پیاری پیاری بچیوں سے کیا کرتے ہیں۔"
"شکریہ میں یہ کپڑا نہیں لے سکتی۔ آپ اسے ٹھیکیدارنی جی کو دے دیں۔ اگر وہ مجھے دیں گی تو میں لے لوں گی۔"
ٹھیکیدارنی کا نام سن کر ٹھیکیدار کو غصہ آ گیا۔
"ارے! وہ کتی کون ہوتی ہے میرے معاملات میں دخل دینے والی۔ میں اس گھر کا مالک ہوں۔ میں تمہیں تنخواہ دیتا ہوں۔ میں تمہارا سارا خرچ برداشت کرتا ہوں۔"
سلمہ نے کہا۔

" لیکن آپ مجھے مفت تنخواہ نہیں دیتے - میں آپ کے بچوں کو پڑھاتی ہوں - گھر کا سارا کام کاج کرتی ہوں - آپ کسی بھی عورت کو میری جگہ رکھیں گے تو وہ پیسے لئے بغیر تو بالکل کام نہیں کرے گی - "

ٹھیکیدار مسکرایا -

" اری ! تم تو خواہ مخواہ ناراض ہو گئیں - میرا مطلب یہ تھوڑی تھا کہ تم نوکرانی ہو - تم تو اس گھر کی مالکہ ہو - میں نے تو تمہیں کبھی نوکرانی نہیں سمجھا - تم اگر چاہو تو یہاں بادشاہی کر سکتی ہو - "

اس کے ساتھ ہی ٹھیکیدار نے آگے بڑھ کر سلمہ کو ایک بار پھر اپنی بغل میں لینے کی کوشش کی- سلمہ نے دیوار کے ساتھ لگ کر کہا -

" ٹھیکیدار جی ! مجھے یہ باتیں بالکل پسند نہیں - میں آپ کی ملازمہ ہوں - آپ کی داشتہ نہیں ہوں - اپنی عزت بیچ کر نوکری نہیں کر سکتی- میں آج ہی نوکری چھوڑ دینے کو تیار ہوں - "

ٹھیکیدار نے جب پانسہ بالکل الٹتے دیکھا تو فوراً کانٹا بدل لیا -

" لو بابا ! میں چلا جاتا ہوں - میں تمہیں ناراض نہیں کر سکتا- تم تو یونہی طیش میں آ گئی ہو"

ٹھیکیدار باہر نکل گیا - سلمہ سمجھ گئی تھی کہ اب اس گھر میں اس کا رہنا مشکل ہو گیا ہے - اور وہاں سے کوچ کرنے کا وقت آ گیا ہے - اس نے سوچا کہ وہ ٹھیکیدارنی جی سے بات کرے- پھر سوچا اس طرح تو وہاں رہنا اور بھی مشکل ہو جائے گا - ٹھیکیدار اسے کبھی معاف نہیں کرے گا - مجبور ہو کر وہ صبر شکر کر کے رہ گئی -"

دسمبر کا مہینہ تھا کہ ٹھیکیدارنی کی بھانجی کی شادی کا دن آ گیا - ٹھیکیدارنی بال بچوں کو سلمہ کے سپرد کر کے اپنی بہن کے ہاں چلی گئی- ٹھیکیدار نے بہانا بنایا کہ وہ گوجرانوالہ جا رہا ہے اور کل شام کو واپس آئے گا - وہ اپنی بیوی کو یہ خیال ہونے نہیں دینا چاہتا تھا کہ وہ اس کی غیر موجودگی میں جوان نوکرانی کے ساتھ اکیلا ہو گا - اسی طرح اسے خدشہ تھا کہ وہ رات کو کسی وقت بھی اچانک واپس آ سکتی ہے - ٹھیکیدارنی ضروری ہدایات دے کر شادی پر چلی گئی- اور کہہ گئی کہ وہ دوسرے روز شام کو واپس آ جائے گی-

" اگر بچوں نے زیادہ تنگ کیا تو انہیں شادی والے گھر لے آنا- تم نے میری بہن کا گھر تو دیکھا ہوا ہے ہی- "

" جی بہتر- "

سلمہ نے شام کا کھانا بچوں کو کھلا کر انہیں کمرے میں سلا دیا اور خود ان کے پاس ہی

چارپائی پر لیٹ گئی - مکان کے بھی دروازے اندر سے بند کر دیئے اور خود لیٹ کر ایک پرانا رسالہ پڑھنے لگی - ابھی اسے پڑھتے ہوئے بمشکل آدھ گھنٹہ ہی گزرا ہو گا کہ دروازے پر کسی نے دستک دی - سلمہ نے سوچا - شاید بیاہ والے گھر سے کوئی پیغام آیا ہے - وہ جلدی سے اٹھ کر صحن میں سے ہو کر ڈیوڑھی میں آئی اور دروازے کی کنڈی کھولنے لگی - اس رات آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے- اور شام کو ہلکا سا چھینٹا بھی پڑ گیا تھا جس کی وجہ سے بڑی سخت سردی ہو رہی تھی- سلمہ نے ایک میلی سی گرم چادر اوڑھ رکھی تھی - اس نے دروازہ کھولا تو سامنے ٹھیکیدار کھڑا تھا - سلمہ کا دل دھک سے رہ گیا - اس کا جی چاہا کہ وہاں سے فوراً بھاگ جائے یا دروازہ بند کر لے لیکن اس دوران میں وہ اندر ڈیوڑھی میں آ گیا تھا- اس نے اندر آ کر سلمہ سے کچھ نہ کہا - صرف اتنا بولا-

"بڑی سردی ہے بھئی! میں تو شام ہی کو گھر لوٹ آیا ہوں- پردیس میں نہیں رہا جاتا-"

اتنا کہہ کر وہ اپنے کمرے کی طرف چل دیا- سلمہ نے دروازہ بند کیا اور بچوں کے کمرے میں آ گئی- ٹھیکیدار نے اپنے کمرے سے آواز دی -

" سلمہ ! بچے سو گئے ہیں کیا ؟"

" جی ہاں -"

" آگ کی انگیٹھی جل رہی ہے ؟"

" جی ہاں- "

" اگر تمہیں ضرورت نہ ہو تو مجھے دے جاؤ - کمرہ تو برف کی طرح ٹھنڈا ہو رہا ہے -"

سلمہ نے کوئلوں سے دہکتی ہوئی انگیٹھی اٹھائی اور ٹھیکیدار کے کمرے میں آ کر آتش دان کے پاس رکھ دی- ٹھیکیدار نے سلمہ سے کوئی بات نہ کی- سلمہ باہر نکل آئی- اپنے کمرے میں آ کر اس نے اندر سے چٹخنی لگائی اور بتی بجھا کر بستر میں دبک گئی اور سونے کی کوشش کرنے لگی مگر نیند کوسوں دور تھی -

اپنے کمرے میں آ کر ٹھیکیدار نے کپڑے تبدیل کئے - دھوتی باندھی- تھیلے میں سے شراب کی بوتل نکالی- گلاس الماری میں سے لیا - دونوں چیزیں میز پر رکھ دیں - جگ میں پانی بھرا- چارپائی پر چوکڑی مار کر بیٹھ گیا اور گلاس میں شراب ڈال کر اسے پینا شروع کر دیا - اسی تھیلے میں سے کباب نکال کر اس نے پاس ہی پلیٹ میں رکھ لئے - کوئی گھنٹہ بھر وہ شراب پیتا رہا- کباب کھاتا اور سگریٹ پر سگریٹ پھونکتا رہا-

جب ڈیڑھ گھنٹہ گزر گیا اور شراب کی نصف بوتل بھی ختم ہو گئی اور ٹھیکیدار پوری طرح نشے میں آ چکا تو اس نے سگریٹ زمین پر پھینک دیا- اٹھ کر کھڑا ہو گیا - ذرا لڑکھڑایا-

دھوتی کس کر باندھی - پاؤں سے سگریٹ مسلا - کمرے کے روشندان کو بند کیا - چھت والی بڑی بتی بجھا کر کونے والی ہلکی روشنی کا ٹیبل لیمپ روشن کیا - آہستہ سے دروازہ کھولا اور باہر صحن میں آ گیا - ٹھنڈی ہوا اس کی پیشانی کو لگی تو اس کے نشے میں اضافہ ہو گیا اور بھاری بھر کم بھالو ایسا جسم گرم ہو کر سلگنے لگا- وہ آہستہ سے چل کر سلمہ والے کمرے کے پاس آیا اور دروازے پر دستک دے کر بولا

" سلمہ ----- سلمہ ---- سلمہ ! "

سلمہ سو گئی تھی- ٹھیکیدار جی کی بات سن کر جاگ پڑی-

"کیا ہے جی ؟"

ٹھیکیدار نے بڑی شریفانہ آواز میں کہا

" بھئی ! ذرا مجھے کمبل تو ٹرنک میں سے نکال کر دے جاؤ - آگ بجھ گئی ہے اور کمرہ ٹھنڈا ہو گیا ہے - جلدی دے جاؤ- مجھے بہت نیند آ رہی ہے -"

اور پھر بلند آواز میں ایک بناوٹی جمائی لیکر اپنے کمرے میں آ کر دروازے کی اوٹ میں آ کر کھڑا ہو گیا - وہ جھوم رہا تھا اور ماتھے پر ہلکا ہلکا پسینہ چمک رہا تھا - وہ نشے میں تھا- بھرپور نشے میں تھا - سلمہ نے سوچا کہ اسے نہیں جانا چاہئے- پھر خیال آیا کہ نہیں وہ مالک ہے - کیا خبر واقعی اسے کمبل کی ضرورت ہو - اسے کمبل دے آنا چاہئے- وہ اسے منہ میں تو نہیں ڈال لے گا -

اتنا سوچ کر وہ اٹھی - اس نے کمرے کی بتی روشن کی اور ٹرنک کھول کر اس میں سے کمبل نکالنے لگی - ٹھیکیدار نے بتی کی روشنی دیکھی اور پھر ٹرنک کے کھلنے کی آواز سنی - اس کے کان کھڑے ہو گئے اور بدبودار سانس پھولے ہوئے نتھنوں میں تیز تیز چلنے لگا - سلمہ کمبل لے کر کمرے سے باہر نکلی اور صحن میں سے ہوتی ٹھیکیدار کے کمرے میں داخل ہوئی - جونہی وہ اندر داخل ہوئی - ٹھیکیدار نے فوراً دروازہ بند کر لیا اور اندر سے چٹخنی لگا دی -

سلمہ نے چونک کر ٹھیکیدار کو دیکھا اور کمبل اس کے ہاتھ سے اپنے آپ پلنگ پر گر پڑا - ٹھیکیدار دروازے کے بیچ میں کھڑا نشے سے جھوم رہا تھا اور مسکرا رہا تھا- سلمہ کا جسم ٹھنڈا پڑ گیا - اس نے فضا میں شراب کی تیز بو سونگھی اور میز پر شراب کی بوتل اور بکھرے ہوئے کباب دیکھے -

" خدا کے لئے مجھے جانے دیں -"

" میری بات مان لو اور چلی جاؤ -"

ٹھیکیدار سلمہ کی طرف بڑھنے لگا- سلمہ پیچھے ہٹنے لگی - وہ اسے دبوچنے لگا - سلمہ جلدی سے میز کی دوسری جانب ہو گئی - ٹھیکیدار نے بڑھ کر اسے پکڑنے کی کوشش کی - اس کوشش

میں وہ میز سے ٹکرایا - میز الٹ گئی اور شراب کی بوتل دری پر گری - بوتل چونکہ بند تھی - اس لئے شراب بہہ جانے سے بچ گئی - ٹھیکیدار نے بوتل اٹھا کر پلنگ پر رکھ دی اور ایک ہی جست میں سلمہ کو دبوچ لیا اور جھٹکے میں اس کی چادر اتار کر پرے پھینک دی -

سلمہ کانپنے لگی -

" خدا کے لئے مجھ پر رحم کریں - میں شور مچا دوں گی - میں سارا محلہ سر پر اٹھا لوں گی- میں شور مچا دوں گی -"

اس سے پہلے کہ سلمہ کوئی آواز نکالے - ٹھیکیدار نے اس کے ایک زور دار لپڑ مار دیا - سلمہ کی آنکھوں میں تارے پھر گئے - اس کے بعد ایک اور لپڑ مارا - پھر تیسرا ' پھر چوتھا - سلمہ نیم جان سی ہو کر زمین پر گر پڑی - ٹھیکیدار نے اسے اٹھا کر بھینچ لیا - اٹھا کر پلنگ پر ڈال لیا-

" حرامزادی ! یہ دیکھ ایک فٹ لمبا چاقو -"

ٹھیکیدار نے سرہانے کے نیچے سے چاقو نکال کر میز پر رکھ دیا -

" اگر ذرا بھی شور مچایا تو انتڑیاں باہر نکال دوں گا - "

سلمہ کے ہونٹ کپکپا رہے تھے- چہرے کا رنگ فق ہو گیا تھا - رخساروں پر تھپڑ کے نیل پڑ گئے تھے - جسم میں جان نہیں رہی تھی - سارا جسم لرز رہا تھا- وہ بار بار ٹھیکیدار کے آگے ہاتھ جوڑنے لگی -

" رحم کیجئے- خدا کے لئے مجھ یتیم پر رحم کیجئے - آپ کو اس سے کیا مل جائے گا - میری زندگی مزید برباد نہ کریں -"

"بکواس بند کر کمینی- اگر پھر زبان کھولی تو چاقو سے زبان کاٹ دوں گا -"

ٹھیکیدار نے چاقو کا پھل سلمہ کے ہونٹوں پر رکھ کر کہا - سلمہ دہشت کے مارے نیم بے ہوش سی ہو گئی- اس کی مٹھیاں بھنچ گئیں اور آنکھیں بند ہو گئیں- ٹھیکیدار نے اس کی قمیض اتار کر پرے پھینک دی اور اس کے سینے پر ہاتھ مار کر بولا -

"کتیا! ہم سے دور دور رہتی تھی - کیا ہم تیرے مالک نہیں ؟"

اس نے گلاس میں اور شراب ڈالی اور بغیر پانی کے سلمہ کا منہ کھول کر زبردستی اس کے حلق میں انڈیل دی- سلمہ کو اچھو آ گیا اور وہ کھانسنے لگی - وہ تلملائی مگر ٹھیکیدار نے چاقو اس کے ننگے بدن پر رکھ دیا- سلمہ سہم کر لیٹی رہی - ایک گلاس شراب کا اس نے خود پیا - تھوڑی دیر بعد شراب کا دوسرا گلاس اٹھا کر اس نے سلمہ کا منہ کھولا تو وہ تڑپ اٹھی- اس کا سر پہلے ہی چکرا رہا تھا اور آنکھوں کے سامنے کمرے کی چیزیں گھومنا شروع ہو گئیں تھیں -

ٹھیکیدار نے فوراً اس کے دونوں ہاتھ اس کی پشت پر باندھ دیئے اور اس کے سینے پر گھٹنا رکھ کر

گلاس شراب زبردستی اس کے منہ میں انڈیل دیا۔ کچھ شراب سلمہ کے گالوں پر بہہ گئی اور کافی اس کے حلق کے اندر چلی گئی ۔ کھانستے کھانستے سلمہ کا برا حال ہو گیا۔ وہ زار و قطار رو رہی تھی ۔ ٹھیکیدار بڑے اطمینان سے ایک ہاتھ میں ننگا چاقو پکڑے دوسرے ہاتھ میں شراب کا گلاس اٹھائے شراب پیتا رہا۔ کوئی آدھ گھنٹے بعد سلمہ کی آنکھیں اپنے آپ بند ہونے لگیں ۔ اس کے اعضاء ست پڑ گئے۔ وہ کبھی کبھی آنکھ اٹھا کر دیکھتی۔ اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں ۔ اور پھر انہیں بند کر لیتی ۔ ٹھیکیدار نے ایک اور پیگ بنا کر سلمہ کو زبردستی پلا دیا ۔ اس پیگ کے حلق میں جانے کے پندرہ منٹ بعد سلمہ کو قے ہو گئی۔ ٹھیکیدار نے کپڑا گیلا کر کے اس کا منہ پونچھ دیا ۔ دو تین بار قے کرنے کے بعد سلمہ کو پھر ہوش نہ رہا کہ وہ کہاں ہے اور اس کے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔

ٹھیکیدار نے ہوس بھری چمکتی آنکھوں سے سلمہ کو دیکھا وہ آنکھیں اندر کو بھینچے گہری نیند میں یا گہرے نشے میں بے سدھ پڑی تھی ۔ اس کی آنکھوں کے گرد یکایک حلقے نمودار ہو گئے تھے اور چہرے کا رنگ سبزی مائل ہو گیا تھا ۔ ٹھیکیدار نے گیلے کپڑے سے اس کا منہ اور گردن صاف کی ۔ چاقو بند کر کے میز پر رکھ دیا اور جھک کر سلمہ کے سینے پر بوسے دینے لگا ۔ پھر اس نے سلمہ کو مادر زاد برہنہ کر دیا اور جنگلی وحشیوں کی طرح خود بھی مادر زاد ننگا ہو کر اس کی چارپائی کے گرد ریچھ کی طرح ناچنے اور خرخرانے لگا ۔ وہ کبھی سلمہ کے عریاں پیٹ پر تھوکتا ۔ کبھی ہاتھ سے اس کا پیٹ ملتا کبھی اس کی ٹانگوں پر سر رکھ دیتا اور کبھی اس کا ٹھنڈا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر زور سے دباتا اور سرد آہیں بھرنے لگتا ۔

یہ خوفناک بہیمانہ کھیل رات بھر جاری رہا ٹھیکیدار نے شریف اور باحیاء سلمہ کے شیشہ عصمت کو چکنا چور کر دیا ۔ صبح جب سلمہ کو ہوش آیا تو اس نے دیکھا تو وہ ایک عریاں بھالو کے پہلو میں بالکل ننگی لیٹی ہوئی ہے ۔ اس کا سر درد سے پھٹ رہا تھا ۔ اس نے بجلی جیسی تیزی کے ساتھ اٹھ کر شلوار قمیض پہنی ، چادر اوڑھی اور سوچنے لگی کہ رات اس کے ساتھ کیا ہوا تھا ؟ ایک ایک کر کے اسے سارے واقعات یاد آتے گئے ۔ اس نے دہشت ناک نگاہوں سے بستر پر خون کے دھبے دیکھے تو اس کے منہ سے چیخ نکل گئی ۔ اس نے اپنا چہرہ دونوں ہاتھوں سے چھپا لیا اور دوڑ کر اپنی کوٹھڑی میں آ گئی ۔ وہاں سے اپنے کپڑوں کی گٹھڑی باندھی اور ڈیوڑھی کا دروازہ کھول کر اس مکان سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے رخصت ہو گئی جس کی سنگین چار دیواری میں اس کے گوہر عصمت پر ڈاکہ ڈالا گیا تھا ۔

سردی میں بھوکی پیاسی چادر اوڑھے سڑکوں پر وہ دکھیاری سارا دن چلتی رہی ۔ آخر بھوک اور پیاس کی شدت سے نڈھال ہو کر وہ سٹیشن پر آ گئی یہاں اسے ایک عورت نے ترس کھا کر

روٹی کھلائی اور چائے پلائی ۔ سلمہ کو کچھ ہوش آیا ۔ اس کی جان میں جان آئی ۔ سلمہ کی یہاں دو ایک سہیلیاں تھیں ۔ لیکن وہ ان کے ہاں نہیں جانا چاہتی تھی ۔ اس میں اس کے سارے خاندان کی بے عزتی اور بدنامی تھی ۔ اس نے سوچا کہ وہ کسی جگہ ملازم ہو جائے گی اور خود کما کر کھائے گی ۔ باتوں ہی باتوں میں جب اس عورت کو سلمہ نے اپنی دکھ بھری کہانی سنائی اور بتایا کہ وہ نوکری کی تلاش میں ہے تو اس بوڑھی عورت نے آنسو بھرتے ہوئے کہا ۔

" بیٹی ! تیری بپتا سن کر تو میرا کلیجہ ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا ہے ۔ میں جس گھر میں رہی ہوں وہ لوگ بڑے اچھے ہیں پشاور کے ہیں تاجر ہیں ۔ بیگم بڑی نیک دل بی بی ہیں میں تمہیں وہاں لئے چلتی ہوں ۔ اگر تمہاری قسمت نے تمہاری مدد کی تو وہاں تمہیں ضرور نوکری مل جائے گی ۔ "

" ماں جی تمہار بہت شکریہ ! تم مجھے وہاں لے چلو ۔ خدا نے چاہا تو مجھے ضرور کام مل جائے گا ۔ "

" ہاں بیٹی ! آخر ایک جوان لڑکی کب تک سڑکوں پر ماری ماری پھر سکتی ہے ۔ میرے ساتھ خدا کا نام لے کر چل میں تمہارے لئے پوری کوشش کروں گی ۔ مجھ سے کسی کی تکلیف بالکل نہیں دیکھی جاتی ۔ "

سلمہ نے پوچھا ۔

" بیگم صاحبہ کا گھر کہاں ہے ؟ "

بوڑھی عورت نے کھانس کر کہا ۔

" شہر میں ہی رہتی ہیں بیٹی ! تم ساتھ چل کر دیکھ لینا ۔ "

شام ہو رہی تھی اور سرما کے موسم کا اندھیرا شہر کے اوپر منڈلا رہا تھا ۔ کچھ دکانوں پر بلب روشن ہو گئے تھے سردی بہت سخت تھی ۔ ہوا تیز اور ہڈیوں کو جما دینے والی تھی ۔ بوڑھی عورت سلمی کو ساتھ لے کر ہائے اللہ ۔ وائے اللہ کرتی تانگے میں سوار ہو گئی اور تانگے کو ایک طرف چلنے کو کہا ۔ تانگہ شہر کے اندر کی طرف والی سڑکوں پر روانہ ہو گیا ۔

سلمہ ان سڑکوں سے بالکل ناواقف تھی ۔ وہ دل ہی دل میں خدا سے دعائیں مانگ رہی تھی کہ یا اللہ نوکری مل جائے اور کہیں سر چھپانے کا آسرا ہو جائے وگرنہ میں سڑکوں پر نہیں پھر سکتی ۔ کافی دیر مختلف سڑکوں پر سے گذرنے کے بعد تانگہ شہر کے عقبی علاقے میں دھند میں ڈوبے ہوئے کھیتوں کے پاس ایک دو منزلہ اکیلے مکان کے باہر آ کر رک گیا ۔

" لو بٹیا اترو ! بیگم صاحبہ کا گھر آ گیا لیکن خیال رکھنا ۔ بیگم صاحبہ کی تعریف کر دینا وہ اپنی تعریف سن کر بڑی خوش ہوتی ہیں "

" اچھا ماں جی " !

بڑھیا نے تانگے والے کو پیسے دیئے اور سلمہ کو ساتھ لے کر مکان کی ڈیوڑھی میں داخل ہو گئی ایک عورت نے بڑھیا کو دیکھ کر سلام کیا اور ڈیوڑھی کے ساتھ والا کمرہ کھول دیا۔ بڑھیا نے سلمہ کو اس کمرے میں بٹھلایا اور بولی۔

"بیٹی! تم یہاں بیٹھو۔ میں بیگم صاحبہ کو خبر کرتی ہوں"

وہ چلی گئی۔ سلمہ نے کمرے کا جائزہ لیا صوفے پڑے تھے۔ زمین پر دری بچھی ہوئی تھی الماریاں بند تھیں۔ دیوار پر ایک عریاں عورت کی تصویر لگی تھی۔ صوفوں کا کپڑا میل سے بھرا پڑا تھا۔ کونے میں ایک پلنگ بچھا تھا پلنگ جھلنگا ہو رہا تھا۔ اور اس پر میلی چادر بچھی ہوئی تھی سلمہ کو یہ ماحول کچھ عجیب سا لگا وہ ابھی کچھ فیصلہ نہ کر سکی تھی کہ وہ کہاں آئی ہے اتنے میں ایک گوری چٹی خوبصورت سی لڑکی اندر آئی اور مسکراتے ہوئے بولی۔ "بیگم صاحبہ نے تمہیں یاد کیا ہے"

سلمہ اس کے ساتھ کمرے سے باہر نکل آئی وہ لڑکی اسے ایک ایسے کمرے میں لے گئی جو تنگ تھا اور جس کا ایک ہی روشندان چھت سے لگا ہوا تھا۔ گوری چٹی خوبصورت لڑکی نے مسکرا کر کہا۔

"یہاں بیٹھو۔ بیگم صاحبہ ابھی آتی ہیں"

اتنا کہہ کر وہ باہر نکل گئی اس کمرے میں اندھیرا چھایا ہوا تھا اور دیواروں سے ٹھنڈ نکل رہی تھی یہاں صرف دو کرسیاں تھیں اور کچھ نہیں تھا۔ زمین پر ایک نہایت ہی میلا اور بوسیدہ قالین بچھا تھا۔ کونے میں ایک انگیٹھی بھی پڑی ہوئی تھی۔ سلمہ یہاں کوئی پانچ دس منٹ اکیلی بیٹھی رہی۔ اتنے میں دروازہ کھلا اور اچانک دو تین ہٹے کٹے مرد اندر آگئے انہوں نے آتے ہی دروازہ بند کرکے کنڈی لگا دی اور سلمہ کے پاس آکر اس کے گرد کھڑے ہو گئے سلمہ کے منہ سے ایک چیخ نکل گئی ایک آدمی نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ دوسرے نے اس کو دونوں ٹانگوں سے پکڑ کر بکرے کی طرح قالین پر گرا دیا۔ سلمہ بالکل بے ہوش ہو گئی۔

جب اسے ہوش آیا تو کمرے میں دو موم بتیاں جل رہی تھیں اور وہ تینوں آدمی اس کے آس پاس بیٹھے شراب پی رہے تھے کمرے کی فضا گرم ہو رہی تھی سلمہ نے دیکھا کہ وہ بالکل ننگی ہے اور اس کے دونوں ہاتھ اور پاؤں دونوں کرسیوں کے ساتھ رسیوں سے باندھ دئے گئے ہیں وہ ماہی بے آب کی طرح تڑپنے اور زارو زار رونے لگی ایک نے اٹھ کر اسے گھونسوں سے مارنا شروع کر دیا دوسرے نے شراب کی بوتل اٹھائی۔ دو آدمیوں نے اس کا منہ کھولا اور پہلے نے بوتل کا منہ سلمہ کے منہ میں ڈال کر بوتل انڈیلنا شروع کر دی۔ سلمہ کے منہ سے غرغراہٹ کی صدائیں بلند ہونے لگیں جب وہ اسے کافی شراب پلا چکے تو اطمینان سے بیٹھ کر اس کا تماشا دیکھنے لگے۔ سلمہ نے چیخیں مار مار کر آسمان سر پر اٹھا لیا مگر وہاں اس کی آواز کوئی نہیں سن رہا

تھا رات کی طرح پھر اس کا سر چکرانے لگا اور آنکھوں کے سامنے چیزیں گردش کرنے لگیں۔ اس کی چیخیں آہستہ آہستہ مدھم ہوتی گئیں۔ تینوں غنڈے پھر شراب پینے اور سلمہ کو پھر فحش گالیاں بکنے لگے۔ سلمہ کو ان کی آوازیں دور سے دور تر ہوتی محسوس ہونے لگیں اس کے بعد پھر اسے ہوش نہ رہا کہ وہ کہاں ہے اور اس کے ساتھ کیا کچھ بیت رہی ہے۔

جب وہ پوری طرح نشے میں دھت ہو کر بے سدھ ہو کر پڑ گئی تو تینوں آدمیوں نے اس کے بازو اور پاؤں کی رسیاں کھول دیں۔ وہ باری باری بے ہوش اور عریاں سلمہ کو گود میں بٹھلا کر پیار کرتے اور مزید شراب پینے لگے سلمہ بے ہوش تھی اسے کوئی خبر نہیں تھی کچھ بھی محسوس نہیں ہو رہا تھا۔ تینوں بدمعاش اس سے کھلونے کی طرح کھیل رہے تھے۔ جب ایک بدمعاش سلمی کو گود میں لے کر پیار کرتا تو دوسرے شرابی جھک کر ان دونوں کو دیکھتے اور فحش گالیاں بکتے اور آپس میں اشارے کرتے جاتے۔ یہ سلسلہ ساری رات جاری رہا صبح تک ان بدمعاشوں نے اس دکھیاری اور قسمت کی ماری لڑکی کو برباد کرکے رکھ دیا۔

سلمی کو اس گھر میں آئے پورے پانچ ماہ گزر گئے تھے۔

اس دوران میں ان لوگوں نے جو دلال تھے اور عورتوں کا ناجائز کاروبار کرتے تھے باقاعدہ اس سے پیشہ کروانا شروع کر دیا اب وہ پہلے کی سی سلمہ نہیں رہی تھی۔ اس کا رنگ کالا پڑ گیا تھا آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے نمودار ہو گئے تھے۔ جسم کمزور ہو گیا تھا اس کا ذہنی توازن کافی حد تک درہم برہم ہو گیا تھا نفسیات تباہ ہو گئے تھے اس نے صبر شکر کرکے اس زندگی کو قبول کر لیا تھا کیونکہ مسلسل ناکامیوں اور بربادیوں نے اسے یقین دلایا تھا کہ دراصل وہ پیدا ہی اس لئے ہوئی ہے کہ اپنی زندگی کو ایک روگ بنا کر گزار دے۔ اس کی نجات اس دنیا میں نہیں ہے پہلے پہل اس نے وہاں سے بھاگنے کی کوشش بھی کی مگر کامیاب نہ ہو سکی۔ غنڈوں نے اسے یقین کروا دیا تھا۔ کہ اگر وہ یہاں سے بھاگ بھی گئی تو وہ اسے جہاں بھی ہوگی، جاکر قتل کر دیں گے۔ وہ عورتوں کے قتل کے بارے میں یوں باتیں کیا کرتے جیسے یہ کوئی بات ہی نہ ہو۔ جیسے کوئی گاجر مولی کاٹ دیتا ہو۔ بالکل اسی طرح وہ عورت کو کاٹ دینے کی باتیں کیا کرتے تھے سلمہ کے دل پر ان کا خوف اور دنیا کی مصیبتوں اور المناکیوں کی دہشت بیٹھ گئی تھی اسے معلوم ہو چکا تھا کہ یہاں سے باہر جاکر بھی سے کہیں عزت کی روٹی نہیں مل سکتی اب وہ اس قابل نہیں رہی کہ کوئی اسے بیاہ کر اپنے گھر بھائی بہنوں میں لے جائے۔ اور اگر اس گندے نالے سے نکل کر پھر کسی بدرو میں گرنا ہے تو پھر بہتر یہی ہے کہ یہیں بیٹھ کر صبر کر لیا جائے وہ آخری بار اپنی عزت اور اپنی حیاء کا ماتم کر چکی تھی۔ اب یہ تجربہ اس کے لئے کوئی نئی حیثیت نہیں رکھتا تھا۔ اس کے باوجود غنڈے اسے گھر سے باہر نہیں نکالتے تھے بلکہ وہیں گھر میں ہی اس سے پیشہ کرواتے تھے۔

عام طور پر سلمہ کے پاس رات کو گاہک آیا کرتے وہ پاؤڈر سرخی لگا کر تیار ہو کر کمرے میں

بیٹھ جاتی اور پھر اسے قسم قسم کے اوباش لوگوں کے سامنے پیش کیا جاتا جو کوئی اسے پسند کر لیتا وہ اس کے پاس وہیں رات کی رات ٹھہر جاتا ۔ وہ سلمہ کے پاس بیٹھ کر کمرے میں شراب پیتا اب سلمہ نے بھی شراب پینی شروع کر دی تھی کیونکہ شراب پی کر وہ اپنے دکھ درد بھول جاتی تھی ویسے بھی اس نے اپنے ماضی کو بھلا دیا تھا وہ یکسر فراموش کردینا چاہتی تھی کہ وہ کس کی بیٹی ہے کس کی بہن ہے اور کسی کی بھتیجی ہے ۔ وہ کہاں رہا کرتی تھی ؟ کیا ہوا کرتی تھی ؟ اب کیا ہو گئی ہے اور کہاں رہنے لگی ہے ۔ وہ اپنے نئے ماحول میں سے ہی خوشی کے جذبات اخذ کرنے کی کوشش کیا کرتی تھی شراب پی کر وہ دنیا جہان کے غموں اور دکھوں کو بھول جاتی اور سگریٹ پر سگریٹ پیتی رات بھر کے دوست سے بڑے انداز سے باتیں کیا کرتی ۔

اس کے اندر کی وہ وحشی اور عشرت پسند عورت باہر نکل آئی تھی جو دنیا کی ہر عورت کے اندر چھپی رہتی ہے ۔ اور باہر نکلنے کے بہانے تلاش کیا کرتی ہے اس کے گاہک اس کے پاس آکر

اس سے طرح طرح اظہار محبت کرتے ۔ اس کے حسن اور جوانی کے قصیدے پڑھتے اسے زیوروں سے لاد دینے اور خوبصورت بیش قیمت لباس کے تحفے دینے کے وعدے کرتے اور رات گزار کر چلے جاتے اور پھر کبھی اس کی طرف رخ نہ کرتے کبھی کوئی بھول کر بھی اسے پوچھنے نہ آتا کہ وہ کس حال میں ہے ؟ وہ بھی ان کی باتوں کو اہمیت نہ دیا کرتی ۔ اب وہ بھی جان گئی تھی کہ سب زبانی اور وقتی باتیں ہوا کرتی ہیں اور بڑی ضروری باتیں ہوتی ہیں ۔ اس قسم کی باتوں کے بغیر نہ مرد کا کام چل سکتا ہے اور نہ عورت ہی اس سے خوش ہو سکتی ہے اسی طرح ایک سال کا طویل عرصہ بھی گزر گیا ۔

سلمی جو کبھی ایک شریف گھرانے کی چار دیواری میں باحیاء لڑکی بن کر رہا کرتی تھی اب نیلم کے نام سے ایک بڑی ہوشیار پیشہ ور عورت بن چکی تھی شراب اور بے حیائی کی شرمناک زندگی نے اس کے چہرے کو بے باک اور فحش بنا دیا تھا آنکھوں کے نیچے متصل حلقے پڑ گئے تھے اس نے اپنے بال نئے فیشن کے مطابق کٹوا لئے تھے وہ چوبیس گھنٹے میک اپ میں رہتی تھی ناخنوں پر کبھی سبز ، کبھی نیلا اور کبھی سرخ پالش کیا کرتی ۔ سگریٹ پی پی کر اس کی انگلیاں جل گئی تھیں ہونٹوں کے کنارے زرد ہو کر سکڑتے گئے تھے وہ انیس بیس سال کی عمر میں تیس برس کی عمر بن گئی تھی جسم کچھ بھاری ہو گیا تھا رنگ جو کبھی کندن کی طرح ہوا کرتا تھا سانولا پڑ گیا تھا آواز بوجھل اور سپاٹ ہو گئی تھی آنکھوں میں ہر وقت ڈورے سے کھچے رہتے تھے ۔ شراب بلا ناغہ پینے لگی تھی اس لئے کہ اس کے گاہک شراب کے بغیر اس کے پاس کبھی نہیں آتے تھے اور ان کے ساتھ بیٹھ کر اسے بھی شراب پینی پڑتی تھی ۔

اب اسے شراب کا نشہ ہو گیا جس روز کوئی گاہک نہ آتا تو وہ خود شراب منگوا لیا کرتی اور

اکیلی بیٹھ کر پیا کرتی لیکن ایسا بہت کم ہوتا تھا اسے کسی بھی رات کو اکیلے سونے کا موقع نہیں ملا تھا ۔ اس کے ساتھ دوسری لڑکیاں بھی تھیں جو اس دھندے میں پڑی ہوئی تھیں وہ سب کی سب سلمہ عرف نیلم کی سہیلیاں بن گئی تھیں ۔ وہ بھی شراب پیتی تھیں اور سگریٹ کے ساتھ سگریٹ لگاتی تھیں اور آپس میں گندی گالیاں بکا کرتی تھیں سلمہ کو اب ایسی ایسی گالیاں ازبر ہو گئی تھیں کہ اگر وہ انہیں آج سے چھ سال پہلے سن لیتی تو غش کھا کر گر پڑتی مگر اب وہ انہیں سنتی نہیں تھی ۔ بلکہ شراب پی کر خود بھی بکا کرتی تھی زندگی نے اپنا محور بدل لیا تھا وہ پھول جو کبھی ایک شریف گھر کی چار دیواری میں کھلا تھا آج ایک طوائف کے کوٹھے پر شرابی کے گلے کا ہار بنا ہوا تھا ۔ سلمہ کی زندگی کبھی اس مہندی کی مانند تھی جسے کنواریاں اپنے ہاتھوں میں لگا کر چھپاتی پھرا کرتی ہیں لیکن آج وہ نیواڑی کی دکان پر لگا ہوا آئنہ بن گئی تھی جسے ہر گاہک ایک نظر جھک کر دیکھنا اپنا فرض سمجھتا تھا ۔

آہ سلمہ ! قدرت نے تجھ سے تیرے کس گناہ کا بدلہ لیا ہے ؟

ریلوے لائن کے ساتھ ساتھ ایک پاگل انسان جارہا ہے ۔ چہرے پر وحشت برس رہی ہے رخساروں کی ہڈیاں باہر کو ابھری ہوئی ہیں منہ پر بے تحاشا بال اگے ہوئے ہیں مونچھوں کے بال داڑھی کے بے ربط اور گندے منہ سے سفید بالوں میں گم ہوگئے ہیں جو خشک ہو کر اڑ رہے ہیں ۔ کپڑے پھٹے ہوئے ہیں انتہائی بوسیدہ میل بھی چار کندھے پر ہے پھٹی ہوئی سیاہ چکٹ یار قندی ٹوپی سر پر منڈھی ہے پاؤں میں پھٹے ہوئے بوٹ ہیں جن پر کیچڑ جما ہوا ہے دور سے ایک گاڑی آرہی ہے پاگل آدمی لائن پر سے پتھر اٹھا اٹھا کر جھولی میں ڈال رہا ہے ۔ اور پھر ایک ایک کرکے اپنے ارد گرد پتھر مار رہا ہے کبھی کتے کی طرح بھونکتا ہے اور پھر خود ہی یوں اچھل اچھل کر پتھر پھینکنے لگتا ہے جیسے حملہ آور کتوں کو پسپا کر رہا ہو گاڑی قریب سے گزر جاتی ہے پاگل آدمی گاڑی کی طرف منہ کرکے بھونکنا شروع کردیتا ہے اور ساتھ ساتھ پتھر بھی پھینکتا جاتا ہے ۔

یہی دیوانہ شہر کی ایک گلی میں سے گزر رہا ہے ۔ وہ اپنے آپ کتے کی طرح بھونکتا ہے اور پھر جھولی میں سے جو اب خالی ہے خیال ہی خیال میں پتھر اٹھا کر ادھر ادھر مارنے لگتا ہے بچے اس کے پیچھے لگے اس کا ٹھٹھا کر رہے ہیں ۔ اس پر ہنس رہے ہیں ۔

" بابا کتوں والا ! بھوں بھوں "

اور پاگل بوڑھا انسان ان کی طرف منہ کرکے زور زور سے بھوں بھوں کرنے لگتا ہے دانت نکال کر وحشیوں کی طرح قہقہے لگاتا ہے اور پھر پیٹ پر ہاتھ مارتا ہے اور آگے گزر جاتا ہے ۔ لڑکے اس کے ساتھ ساتھ ہنستے شور مچاتے اس پر روڑے پھینکتے آوازے کستے چلے جارہے ہیں اگر اس وقت کسی شخص کے کان میں کہا جائے کہ یہ جو دیوانہ بوڑھا پھٹے حالوں ، وحشت زدہ چہرہ

لئے بال بکھرائے، گندے، کپڑوں میں کتے کی طرح بھونکتا چلا جا رہا ہے۔ کبھی شہر کے ایک بنک کا منیجر تھا اور اعلیٰ ترین لباس پہن کر ایک خوبصورت عورت کی بانہوں میں بانہیں ڈال کر شہر کی بہترین کلب کے ہال میں رقص کیا کرتا تھا۔ کہ وہ شخص کبھی اعتبار نہیں کرے گا۔ بلکہ ایسی بات کہنے والے کو پاگل سمجھے گا۔

لیکن اس دنیا میں ایسی ایسی متحیرالعقول باتیں ہوتی رہتی ہیں کہ بعض اوقات ان کے سامنے جادو کے قصے مات پڑ جاتے ہیں۔ قدرت کبھی کبھی ایسا ڈرامہ کھیلتی ہے کہ بڑے بڑے جادو نگار ڈرامہ نگار دانتوں تلے انگلی داب کر رہ جاتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ جو دیوانہ شخص ابھی ابھی گلی میں سے گزر گیا ہے اور جس پر لڑکوں کا ہجوم آوازے کس رہا ہے میر صاحب ہیں۔

وہی میر صاحب جو کبھی اس خوش حال گھرانے کے مالک تھے جن کے ساتھ بیٹھ کر شہر کی حسین ترین عورت شراب و نغمے کے پھول برسایا کرتی تھی۔ جن کے بیگ میں ہزاروں روپوں کے نوٹ ہوا کرتے تھے۔ اور جو دو گھوڑا بوسکی کے علاوہ کوئی کپڑا نہیں پہنا کرتے تھے۔ جنہوں نے ایک عورت کی محبت کو جیتنے کے لئے لاکھوں روپے کا غبن کیا اور پھر اس غبن کی وجہ سے پیدا شدہ حالات کے باعث انہیں اس عورت کو قتل کرنا پڑا۔ پاگل میر صاحب گندے چیتھڑے لٹکائے شہر کی سڑکوں پھرتے پھراتے جیل خانے والی عمارت کو جانے والی سڑک پر ہو لئے۔

راستے میں ان کی دیوانہ حرکتیں جاری رہیں یعنی خیالی کتوں پر پیچھے مڑ مڑ کر اچھل اچھل کر خیالی پتھر پھینکتے رہے راہ گیر ان پر ہنستے ہوئے قریب سے گزر جاتے ضعیف الاعتقاد لوگ انہیں مجذوب سمجھ کر ان کے ساتھ لگ گئے۔ کوئی ان سے اپنے بیٹے کے بارے میں پوچھتا کہ وہ کب صحت مند ہو گا کوئی عورت اپنی بیٹی کا رونا روتی کوئی ان سے بیٹے کا پوچھتا۔ لیکن میر صاحب ان کی باتوں سے بے نیاز ان پر بھوں بھوں کرتے جھپٹتے اور پتھر مارتے۔

جس وقت وہ جیل خانے کے دروازے کے سامنے سے گزرے عین اس وقت جیل خانے سے جیلر کی کوٹھی میں کام کرنے والے قیدی قطار باندھ کر باہر نکل رہے تھے ان میں اسلم بھی تھا۔ جب یہ جلوس دیوانے میر صاحب کے قریب سے گزرا تو میر صاحب ان پر بھونکنے لگتے قیدیوں نے ہنستے ہوئے ان پر آوازے کسنے شروع کر دیئے۔ اسلم نے ایک نظر میر صاحب کو یعنی اپنے باپ کو دیکھا جو اب ایک اور ہی دنیا میں ایک اور حلیئے میں تھا اور قیدیوں کے ساتھ یاسمین کے خیال میں مگن آگے گزر گیا۔ دیوانے میر صاحب ان قیدیوں پر یوں ہی ہاتھ اٹھا اٹھا کر خیالی پتھر پھینکتے جاتے اور ساتھ ساتھ کتے کی طرح بھونکتے جاتے تھے قیدی کوٹھی کے احاطے کی طرف مڑ گئے اور پاگل آدمی سیدھا سڑک پر چلتا چلا گیا۔

اس روز جیلر صاحب نے اسلم کو اپنے ہاں بلایا۔ وہ لان کی دھوپ میں بیٹھے چائے پی رہے تھے۔ انہوں نے اسلم کو اپنے پاس کرسی پر بٹھلایا۔ چائے بنا کر دی۔ سگریٹ پیش کیا اور ادھر

ادھر کی باتوں کے بعد پوچھا۔

"اسلم! تمہیں کوئی تکلیف تو نہیں"

"جی نہیں شکریہ! قیدی ہونا بذات خود بہت بڑی تکلیف اور شرمندگی ہے"

جیلر نے کہا۔

"ٹھیک ہے اسلم! لیکن اب کیا ہو سکتا ہے ویسے میں نے حکومت کو تمہاری سفارش کی ہے۔ میرا خیال ہے کہ اب کے یوم آزادی پر تمہاری سزا ضرور معاف ہو جائے گی"

اسلم بڑا اداس تھا۔ جانے کیوں اسے محسوس ہونے لگا تھا کہ جیل سے رہا ہو کر وہ یاسمین سے کبھی نہیں مل سکے گا۔ وہ کہاں جائے گا جانے پھر کوئی اسے کوٹھے میں آنے بھی دے یا نہیں۔ جیلر نے اسلم کو غمگین دیکھ کر کہا۔

"کیا بات ہے؟ تم اداس کیوں ہو؟ کیا گھر یاد آ رہا ہے؟"

"گھر تو کوئی بھی نہیں۔۔۔ اور اسی لئے اداس ہوں" سوچتا ہوں رہائی کا کیا فائدہ جب کہیں کوئی ٹھکانہ ہی نہیں اس سے تو بہتر ہے کہ جیل میں ہی رہوں۔

جیلر نے ہمدردانہ لہجے میں کہا۔

"تم شریف خاندان کے نوجوان ہو اسلم! میں جانتا ہوں کہ تم اس دنیا میں اکیلے ہو آخر یہ گھر بھی تمہارا ہے تم نے میری بچی کی جان بچا کر مجھے بھی خرید لیا ہے۔ تم اگر چاہو تو جیل سے رہا ہونے کے بعد یہاں رہ سکتے ہوں میں تمہاری ملازمت کا بھی بندوبست کروں گا۔ اس کے بعد اگر تم چاہو تو جہاں چاہے جا سکتے ہو۔"

اسلم نے تشکرانہ نظروں سے جیلر کو دیکھ کر کہا۔

"آپ کی پہلے ہی مجھ پر بڑی مہربانیاں ہیں میں آپ کے احسانوں کا ساری عمر بدلہ نہ چکا سکوں گا"

جیلر نے چائے کی پیالی میز پر رکھ دی۔

"تمہارا مجھ پر ایک احسان اتنا بڑا ہے کہ میں عمر بھی کوشش کروں گو اس کا بدلہ نہیں چکا سکتا"

اتنے میں یاسمین بھی اندر سے آ گئی اس نے سبز سویٹر پہن رکھا تھا اور چہرہ سردی سے لال ہو رہا تھا دھوپ میں آ کر اس کا خوبصورت چہرہ تر و تازہ پھول کی طرح شگفتہ دکھائی دینے لگا۔ اس نے اسلم کی طرف دیکھ کر مسکرا کر کہا۔

کہیئے کیا حال ہے اسلم صاحب؟"

"شکریہ خدا کا شکر ہے"

یاسمین نے اپنے باپ سے کہا۔

" ڈیڈی ! ذرا اپنی سہیلی کے ہاں جا رہی ہوں ہم دونوں کو بازار سے کچھ چیزیں خریدنی ہیں ۔ دوپہر تک واپس آجائیں گی "

" ضرور جاؤ بیٹی مگر دوپہر کے کھانے پر ضرور پہنچ جانا ۔ "

" ڈونٹ وری ڈیڈی "

یاسمین نے جاتے جاتے چور آنکھ سے اسلم کی طرف دیکھ کر زیر لب مسکرا کر چلی گئی تھوڑی دیر بعد اسلم بھی وہاں سے اٹھ کر واپس اپنے کام پر دوسرے قیدیوں میں چلا آیا ۔

یوم آزادی آیا تو جن دوسرے قیدیوں کی باقی ماندہ سزائیں معاف ہوئی ' ان میں سے اسلم بھی شامل تھا ۔ اسلم کو بڑی خوشی ہوئی اس نے قیدیوں کا لباس اتار کر اپنی وہی پرانی قمیض پتلون پہنی اور مسرور چہرہ لئے آزاد ہو کر جیل کے دروازے سے باہر آگیا ۔

باہر دوسرے قیدیوں کے لواحقین انہیں لینے کے لئے پھولوں کے ہار لے کر آئے ہوئے تھے مگر اسلم کو لینے کوئی بھی نہ آیا تھا اور آتا بھی کہاں سے ؟ اسلم کا تو کوئی اس شہر میں نہیں تھا ۔ وہ اداس ہو کر باہر والے باغ میں بیٹھا رہا پھر اٹھ کر ایک سیلون میں گیا ۔ شیو بنوائی کپڑے پہنے اور باہر سڑک پر آگیا ۔ یہاں سے وہ سیدھا یاسمین کے مکان میں گیا یاسمین لان اور برآمدے میں کہیں بھی نہیں تھی ۔ اس نے برآمدے میں جا کر گھنٹی بجائی یاسمین نمودار ہوئی اس نے اسلم کو بالکل ہی نہ پہچانا ۔ بولی

آپ کو کس سے ملنا ہے ؟

اسلم نے مسکرا کر کہا ۔

" یاسمین سے "

اب یاسمین نے اسلم کی آواز پہچان لی ۔ خوشی سے اس کی چیخ نکل گئی ۔

" اسلم ! تم ؟ "

" میں نہیں ہوں کیا ؟ "

" میرے خدا تم آزاد ہو گئے ۔ ڈیڈی کل ہی کہہ رہے تھے کہ اسلم کا نام بھی آگیا ہے تم کتنے پیارے لگ رہے ہو اسلم ! معلوم ہوتا ہے تم کبھی قیدی نہیں رہے "

اسلم نے کہا ۔

" میں تو اب بھی قیدی ہوں ۔

" وہ کیسے ؟ "

پہلے تمہارے والد کا تھا اب تمہارا ہوں "

یاسمین اور اسلم دونوں ہنس پڑے یاسمین نے اسلم کا ہاتھ تھاما اور اسے اندر اپنے کمرے ں لے گئی ۔

" اب تم آزادی سے اس گھر میں پھر سکتے ہو جانتے ہو ڈیڈی نے کہا ہے اسلم ! یہ گھر تمہارا ہے تم جب تک چاہو اس گھر میں رہ سکتے ہو "

اسلم نے یاسمین کی گردن پر انگلیاں پھیرتے ہوئے کہا ۔

میں تو تمہیں اپنے گھر لے جانے کی فکر میں ہوں "

یاسمین شرما کر بولی ۔

وہ دن بھی آجائے گا ۔ اچھا بتاؤ چائے بناؤں یا کافی ؟ "

" کافی "

" گڈ "

کوٹھی کے لان میں بیٹھ کر انہوں نے کافی پی ۔ یاسمین اسلم کے لئے سگریٹ لانے اپنے ڈیڈی کے کمرے میں گئی ۔ تو اسلم لان کی دھوپ میں بیٹھا کتنی دیر تک ان جھاڑیوں کو دیکھتا رہا جہاں اس نے یاسمین کے جسم میں سے سانپ کا زہر چوس کر تھوک دیا تھا ۔ یہاں سے اسے وہ اینٹوں کا چبوترہ بھی نظر آرہا تھا جس پر بیٹھ کر اس نے پہلی بار یاسمین کو دیکھا تھا اور پھر روز دیکھا کرتا تھا ۔ اتنے میں یاسمین سگریٹ کا ڈبہ لے کر ہی آگئی ۔

" اسلم تم سگار نہیں پیا کرتے ؟ "

" نہیں وہ کڑوے زیادہ ہوتے ہیں "

" اندر سگار بھی پڑے تھے ۔

کوٹھی کے گیٹ میں یاسمین کے ڈیڈی داخل ہوئے انہوں نے لان میں آکر اسلم کو مبارک باد دی ۔

" مبارک ہو اسلم ! مجھے بہت خوشی ہوئی ہے ۔ تم آزاد ہو گئے ہو ۔ "

" خدا کا شکر ہے ویسے اس میں آپ کی مہربانیاں بھی شامل حال ہیں ورنہ میں اس لائق نہیں تھا ۔ "

جیلر نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا ۔

" نہیں بیٹا ! ایسی بات نہیں تم یقیناً اس لائق تھے کہ تمہاری سزا معاف کردی جاتی میں تمہاری شرافت اور مخلصی کا بہت مداح ہوں "

" آپ کی عالی ظرفی ہے "

جیلر نے یاسمین سے کہا ۔

"یاسمین ! اسلم کو کافی پلائی ؟ "

" ہاں ڈیڈی ! آپ کے لئے بھی بناؤں ؟ "

" بنا دو آج موسم بڑا خوشگوار ہے "

اس کے بعد کئی ایک موضوعات پر باتیں ہوتی رہیں اسلم کچھ کچھ اداس تھا اور کسی وقت ایک گہری سوچ میں گم ہو جاتا یاسمین نے اسلم کے اس موڈ کو بھانپ لیا تھا جیلر نے بھی کچھ محسوس کرتے ہوئے پوچھا ۔

تم اپنا سامان لے آئے ہو نا "

" میرا سامان ہی کیا تھا جو لاتا ؟ "

" تمہارے کپڑے وغیرہ ؟ "

جی ہاں ! کپڑے تھے گھڑی تھی ۔ فونٹین پین اور سونے کے بٹن تھے ۔ یہ چیزیں میرے پاس موجود ہیں "

کچھ دیر کی خاموشی کے بعد جیلر نے کہا "

اسلم بیٹا ! تمہیں پریشان ہونے کی کوئی ضرورت نہیں ۔

اس گھر کو بھی تم اپنا ہی گھر سمجھو جب تک چاہے یہاں رہو

مجھے خوشی ہو گی کہ میں تمہاری خدمت کر رہا ہوں "

اسلم نے شرمندہ سا ہو کر کہا ۔

بات دراصل یہ ہے کہ میں آپ کو تکلیف نہیں دینا چاہتا ۔

اور پھر ہو سکتا ہے ۔ آپ کے عزیز و اقارب اس بات کا برا مانیں کہ ایک اجنبی شخص جو کل تک جیل میں قیدی تھا ۔ آپ کے ہاں رہ رہا ہے ۔ "

جیلر ہنس پڑا ۔

" کیسی باتیں کرتے ہو بیٹا! اول تو میرے یہاں عزیز و اقارب ہی کوئی نہیں اور اگر ہوں بھی تو کسی کو میرے معاملات میں دخل دینے کی کیا پڑی ہے ۔ بس اب تم چپکے سے یہاں رہ جاؤ ۔ آخر تم کہاں مارے مارے پھرو گے ۔ "

" یاسمین ! "

" جی ڈیڈی ۔ "

" اسلم کو میرے ساتھ والا کمرہ خالی کرا دو اور وہاں ملازمہ سے کہہ کر اس کے لئے ضروری سامان رکھو اور میں کل ہی تمہاری نوکری کی کوشش کروں گا ۔ جب نوکری مل جائے گی اور تمہارے پاس کچھ اثاثہ جمع ہو جائے گا تو بیشک جہاں جی چاہے چلے جانا لیکن اس کسمپرسی کی حالت میں میں تمہیں در بدر کی ٹھوکریں کھانے کے لئے نہیں چھوڑ سکتا ۔ "

" جیسے آپ کی مرضی ۔ "

" اچھا بھئی یاسمین ! ملازمہ سے کہو ۔ کھانا لگا دے ۔ بھوک نے تنگ کرنا شروع کر دیا ہے ۔

یاسمین نے ملازمہ کو آواز دی اور جیلر اور اسلم اٹھ کر اندر چلے گئے ۔

اسلم نے جیلر کے ہاں رہنا شروع کر دیا ۔ وہ یاسمین سے اس قدر قریب ہو گیا تھا کہ جب اور جس وقت چاہے ' اس سے ملاقات کر سکتا تھا ۔ اس سے باتیں کر سکتا تھا ۔ اسلم بے حد خوش تھا کہ آخر اس نے یاسمین کا قرب حاصل کر لیا ہے ۔ یاسمین کو بھی اسلم کے وہاں رہ جانے کی از حد خوشی تھی ۔ وہ سہ پہر کو اکٹھے بیڈ مٹن کھیلتے ۔ شہر میں سیر کو جاتے ۔ سینما دیکھتے ' ہوٹل میں جا کر کافی پیتے ۔ وہ دونوں آپس میں بڑے گھل مل گئے تھے ۔ وہ زیادہ ایک دوسرے کے قریب آ گئے تھے اور ان کی محبت زیادہ گہری اور مخلص ہو گئی تھی ۔ وہ ایک دوسرے کو زیادہ سے زیادہ سمجھنے لگے تھے ۔ اور ایک دوسرے کی کمزوریوں سے واقف ہو گئے تھے ۔ یاسمین کو بخوبی علم ہو گیا تھا کہ اسلم اپنے ماضی کا ذکر سننا کبھی پسند نہیں کرتا ۔ چنانچہ اس نے اس کے ماضی کی کبھی کوئی بات نہیں کی تھی ۔ اسلم بھی اپنے ماضی کی تلخ یادوں کو زیادہ سے زیادہ فراموش کرنے کی سعی کر رہا تھا ۔ وہ کبھی اپنی کوٹھی کی طرف نہیں گیا تھا ۔ نہ اس نے نجمہ کی کوٹھی کا کبھی رخ کیا تھا اور نہ ہی کبھی سنگز کلب میں داخل ہوا تھا ۔ ایک دو بار پرویز کو اس نے دیکھا ۔ پرویز نے اسے بلانا بھی چاہا مگر اسلم نے اس قدر بے رخی سے کام لیا کہ پرویز اپنا سا منہ لے کر رہ گیا ۔ اسلم کو سارے واقعات معلوم ہو چکے تھے ۔ یہ کہ اس کے والد نے غبن کرنے کے بعد مفرور ہو گیا تھا ۔ اور اس کا آج تک پتہ نہیں چل سکا کہ وہ کہاں ہے ؟ نجمہ قتل ہو گئی تھی اور اس کے قاتل کا بھی آج تک سراغ نہیں لگایا جا سکا تھا ۔ اس کی والدہ اللہ کو پیاری ہو گئی تھیں مگر اسے انکی قبر کا علم نہیں تھا ۔ ورنہ وہ ماں کی قبر پر ضرور جاتا ۔ سلمہ کی اسے کوئی خبر نہیں تھی کہ وہ کس حال میں ہے اور کہاں ہے ؟ اسلم نے ان واقعات کو معلوم کرنے کے بعد اس باب کو بند کر دیا تھا اور کبھی بھول کر بھی ان لوگوں کو یاد نہیں کیا تھا جن کی وجہ سے اس کا گھر تباہ و برباد ہو گیا تھا ۔

ان دنوں اسلم کا ایک دوست ارشد تھا جو ایک فرم میں ملازم تھا ۔ ارشد سے اسلم کی ملاقات شہر کے ایک بڑے ہی خوبصورت ہوٹل میں ہوئی تھی ۔ ارشد عاشق مزاج آدمی تھا اور شراب کا بھی رسیا تھا ۔ وہ بیک وقت کئی ایک عورتوں سے عشق کر رہا تھا اور اپنی ساری کمائی ان چیزوں پر خرچ کر دیتا تھا ۔ ویسے ارشد دل کا بڑا اچھا ' صاف گو ' دلچسپ اور دیانت دار آدمی تھا ۔ وہ اسلم کے تمام واقعات سے باخبر تھا مگر اس کی بڑی عزت کرتا تھا ۔ اسے معلوم تھا کہ اسلم یاسمین سے محبت کر رہا ہے اور شادی کا خواہش مند ہے ۔ وہ اسلم کا ہم راز بن گیا تھا ۔ وہ یاسمین کا بڑا احترام کرتا تھا اور کبھی کبھی وہ تینوں اکٹھے بیٹھ کر کافی پیا کرتے یا سینما دیکھنے چلے جایا کرتے تھے ۔ ارشد کے ماں باپ دلی میں مقیم تھے اور ارشد اس شہر میں بالکل اکیلا رہتا تھا ۔ ایک ہوٹل میں اس نے کمرہ لے رکھا تھا ۔ جہاں وہ رات گئے جاتا اور بستر پر گر کر پڑ رہتا ۔

ایک روز ارشد اسے اپنے ایک دوست کی کوٹھی پر لے گیا جس نے اپنی ولایت جانے کی خوشی میں دوستوں کی الوداعی پارٹی کر رکھی تھی۔ وہاں شراب اور رقص کا بھی انتظام کیا گیا تھا۔ رات گئے تک اس کوٹھی میں شراب کا دور چلتا رہا اور طوائف کا مجرا ہوتا رہا۔ یہاں ارشد نے اسلم کا تعارف ستارہ نامی ایک خوبصورت لڑکی سے کروایا۔ ستارہ پیشہ ور لڑکی تھی اور رات کو اپنا دھندا کرتی تھی۔ اسلم کو ان باتوں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ لیکن ارشد نے اسے بتایا۔

" ستارہ بڑی ہوشیار لڑکی ہے۔ سب سے بڑھ کر اس میں یہ خوبی ہے کہ اس کے پاس بعض ایسی لڑکیاں موجود ہیں جو حسن و خوبصورتی اور شباب میں اپنی ثانی نہیں رکھتی۔ یہ اونچے طبقے کی لڑکیاں تو برف کی طرح سرد ہوتی ہیں اسلم! خدا کی قسم ستارہ کے پاس ایسی ایسی لڑکیاں ہیں کہ ہمالیہ کی برف پر نظر ڈال دیں تو وہ بھی پگھل جائے۔"

اسلم یوں ہی مسکراتا رہا۔ پارٹی ختم ہو گئی۔ ارشد ستارہ سے دوبارہ ملنے کا وعدہ کر کے اسلم کے ساتھ گاڑی میں بیٹھ کر اپنے ہوٹل آ گیا۔ اس نے اسلم کو اس کی کوٹھی پر چھوڑ دیا۔

ایک ہفتے کے بعد دونوں کی پھر ملاقات ہوئی تو ارشد نے کہا۔

" اگر جوانی کے گرم ابلتے چشمے کو دیکھنا چاہتے ہو تو آج رات میرے ہوٹل میں آ جانا۔"

اسلم نے پوچھا۔

" وہاں کیا ہو گا؟"

" وہی جو اس سے پہلے تم نے کبھی نہیں دیکھا ہو گا۔"

" میں نہیں آؤں گا۔"

" کیوں؟"

" میں جانتا ہوں وہاں کیا ہو گا۔ بے معنی قسم کی جاہل آوارہ لڑکیوں کا مجمع ہو گا اور کیا ہو گا۔"

ارشد نے اسلم کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

" آخر تمہیں آنے میں کیا حرج ہے۔"

" کوشش کروں گا۔"

لیکن رات کو اسلم ارشد کے ہوٹل میں پہنچ گیا۔ ارشد اپنے کمرے میں موجود تھا۔ سرما کا چل چلاؤ تھا۔ دن کو لوگ بھی دھوپ اور چھاؤں کے سنگم پر چلا کرتے تھے مگر رات کو بدستور سردی ہو جایا کرتی تھی۔ ارشد نے کمرے میں ہیٹر لگا رکھا تھا۔ میز پر شراب کی بوتل کھلی تھی اور ایک کھلے بالوں والی خانہ بدوش لڑکی ارشد کے پاس بیٹھی اس کے ساتھ مل کر شراب پی رہی تھی۔ اسلم کو اس منظر سے کچھ کراہیت سی محسوس ہوئی لیکن وہ اندر جا کر بیٹھ گیا۔ ارشد نے اس کے لئے ایک پیگ بنایا۔ اسلم آہستہ سے وہسکی پینے لگا۔ وہ خانہ بدوش لڑکی اسے گھور

گھور کر دیکھ رہی تھی اور ارشد کی طرف دیکھ دیکھ کر بار بار مسکرا رہی تھی۔

" تمہارا دوست بڑا شریف آدمی معلوم ہوتا ہے۔"

ارشد نے اس لڑکی کے ایک دھپ جما کر کہا۔

" اری! معلوم کیا ہوتا ہے۔ وہ تم ہم سب سے زیادہ ہی شریف آدمی ہے۔"

تھوڑی دیر بعد وہاں دو برقعہ پوش اور لڑکیاں آ گئیں۔ انہوں نے اندر آتے ہی برقعے اتار دیئے اور صوفوں پر ٹانگیں پسار کر بیٹھ گئیں اور سگریٹ پینے لگیں۔ دونوں دبلی اور زرد رو لڑکیاں تھیں اور ان کے چہرے بگڑے سے تھے۔

اب باقاعدہ شراب کا دور چل پڑا۔ جب سب لڑکیوں کو نشہ چڑھ گیا تو وہ خرمستیاں کرنے لگیں اور ارشد نے فحش مذاق شروع کر دیا۔ اسلم نے زیادہ وہسکی نہیں پی تھی۔ وہ پورے ہوش و حواس میں تھا۔ ایک لڑکی اس پر گر پڑی اور بانہیں گلے میں ڈال کر بلائیں لینے لگی۔ اسلم نے اس کے بازو اپنی گردن سے الگ کر دیئے۔ لڑکی نے منہ بنا کر کہا۔

" تم مرد ہو یا کیا ہو؟"

ارشد نے اس لڑکی کی چوٹی کھینچ کر کہا۔

" بکواس بند کرو کمینی عورت۔"

لڑکی نے ہلکی سی چیخ مار کر اپنی چوٹی ارشد کی گرفت سے چھڑا لی اور دوسری لڑکی سے بولی

" کیا تمہارے دوست کو ہم پسند نہیں ہیں؟"

ارشد نے کہا۔

" کچھ ایسی ہی بات معلوم ہوتی ہے۔"

خانہ بدوش لڑکی نے مسکرا کر کہا۔

" اگر یہ نیلم کو دیکھ لے تو غش کھا کر گر پڑے۔"

ارشد نے نعرہ لگا کر کہا۔

" ہائے نیلم! توبہ نیلم کا تو سارے ملک میں جواب نہیں۔ وہ تو دیوی ہے دیوی ------- لولو بریجڈا ہے، صوفیہ لورین ہے۔ وہ صورت نہیں ایٹم بم ہے۔ یوری گاگارین ہے۔ برجی بارود ہے۔"

اسلم کے دل میں خواہ مخواہ نیلم کو دیکھنے کا اشتیاق پیدا ہو گیا۔ پھر اس نے اس خیال کو ذہن سے نکال دیا۔ اب سب نے مل کر کھانا کھایا۔ ارشد لڑکیوں سے خرمستیاں کرنے لگا۔ اسلم نے اجازت لی اور وہاں سے نکل کر باہر آ گیا۔ سڑک پر آ کر اس نے اطمینان کا سانس لیا اور

ٹیکسی میں بیٹھ کر سیدھا گھر آگیا -

ایک ہفتہ بعد ارشد نے اسلم کے کان میں یوں ہی سحر پھونکا -

" یار سنا ہے - ستارہ کے ہاں قاہرہ کی ایک بڑی خوبصورت لڑکی آئی ہے - کیا خیال ہے ؟ کہتے ہیں دریائے نیل کے کنارے قلوپطرہ کے بعد آج تک ایسی حسین لڑکی پیدا نہیں ہوئی -"

اسلم نے پوچھا -

" وہ لڑکی ان لوگوں کے ہاتھ کیسے آگئی ؟" ارشد نے ہنس کر کہا -

" ارے تمہیں نہیں معلوم ---- ان لوگوں کا جال بڑی دور دور تک پھیلا ہوا ہے - یہاں تو راتوں رات سوڈان سے ایک لڑکی آتی ہے اور صبح کو اس کا سودا کر کے ہانگ کانگ روانہ کر دیا جاتا ہے -"

" ہمیں تو چاہئے کہ ہم پولیس کو اطلاع کر دیں -"

" ٹھیک ہے مگر ثبوت کوئی نہیں - ان لوگوں کے اڈوں پر کئی بار چھاپے پڑ چکے ہیں مگر سوائے چند ایک لڑکیوں کی گرفتاری اور بعد ازاں ضمانت پر رہائی کے اور کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوا- میرا خیال ہے - اگر تم تیار ہو جاؤ تو آج رات ستارہ کے اڈے پر جا کر نیل کی شہزادی کے درشن کیئے جائیں -"

اسلم نے کہا -

" میرا دعویٰ ہے وہ لڑکی نیل کی وادی کی کبھی نہیں ہو سکتی - یوں ہی ادھر ادھر سے کوئی پکڑ لائے ہوں گے -"

" یہی دیکھنے کے لئے تو ہم جا رہے ہیں -"

اسلم راضی ہو گیا - محض یہ معلوم کرنے کے لئے کہ مصری لڑکی یہاں کیسے آ سکتی ہے اور وہ بھی پیشہ ور عورت کے روپ میں -"

رات کو ارشد گاڑی لیکر آگیا - اسلم اس میں سوار ہو گیا - گاڑی شہر سے باہر کے علاقے میں آگئی - سردی کی وجہ سے کھیتوں میں دھند پھیلی ہوئی تھی اور مکانوں کے ارد گرد دھواں منڈلا رہا تھا - ارشد نے ایک کھیت کے کنارہ کھڑے تنہا مکان کے باہر گاڑی روک دی - یہ علاقہ بڑا گندا علاقہ تھا اور کھیتوں میں غلیظ پانی کھڑا تھا - آس پاس کتے بھونک رہے تھے - ارشد اسلم کو لے کر اس مکان کے اندر داخل ہو گیا- پہلے کمرے میں ایک ادھیڑ عمر کی عورت نے ارشد کا خیر مقدم کیا - ارشد نے اسلم کا تعارف کرایا- عورت نے پان پیش کیئے- ارشد نے کہا -

" سردی بڑی ہے اماں ! پہلے چائے پلواؤ -"

" ابھی بنواتی ہوں بیٹے !"

وہ عورت باہر چلی گئی - ارشد نے اسلم کو بتایا کہ وہ عورت اس قحبہ خانے کی منتظمہ ہے- اس کے زیر نگیں کوئی ستر کے ہی قریب عورتیں پیشہ کما رہی ہیں - ادھیڑ عمر کی عورت نے خوب زیور وغیرہ پہن رکھے تھے اور چہرے پر ایک بھی جھری کا نشان نہیں تھا -

ارشد نے کہا -

" دیکھا اس عمر میں بھی کتنی جوان معلوم ہو رہی ہے - میاں بے فکری ہے بے فکری -"

" لعنت ہے ایسی صحت پر -"

" تم اب پندو نصائح چھوڑو اور یہ دیکھو کہ پردہ کیونکر اٹھتا ہے -"

تھوڑی دیر بعد وہ عورت واپس آگئی - خادمہ نے چائے کا ٹرے اٹھا رکھا تھا- چائے پی جانے لگی- باتوں ہی باتوں میں ارشد نے پوچھا -

" اماں ! ہم تو اب تمہارے ایک نگینے کی بڑی دھوم سنکر یہاں آئے ہیں-"

" کون نگینہ ؟" عورت نے پان لگاتے ہوئے پوچھا -

" مصر کی شہزادی ------ نیل کی رانی -"

عورت مسکرائی -

" ارے بیٹا ! تم ذرا لیٹ آئے ہو - اسے ابھی ابھی ایک جگہ بھیج دیا ہے -"

" ارے اماں ! تم نے تو ظلم کر دیا ہم پر -" ارشد نے زمین پر پاؤں مار کر کہا- عورت نے پان پیش کیئے -

" اب کیا ہو سکتا ہے بیٹا! ذرا پہلے آتے تو وہ یہیں تھی - "

اسلم کا اس فضا میں دم گھٹا جا رہا تھا - اس نے موقع غنیمت جانتے ہوئے کہا-

" پھر سہی اب چلتے ہیں -"

عورت بولی -

" لو پان کھاؤ- اتنی جلدی بھی کیا ہے - دوسرا مال دیکھ لو- خیر سے ایک سے ایک بڑھ کر ہے -"

ارشد نے کہا-

" ہاں ہاں یار اسلم ! اب آئے ہیں تو خالی ہاتھ واپس نہیں جانا چاہئے- گنگا بہہ رہی ہے- ایک چلو بھر ہی لینا چاہئے -"

عورت نے مسکرا کر اٹھتے ہوئے کہا-

" کیوں نہیں - لو تم یہاں ٹھہرو - میں لڑکیوں کو بھیجتی ہوں -"

ارشد بھی اس عورت کے ساتھ ہی اٹھا۔ اس نے اسلم سے کہا۔

"تم یہاں ٹھہرو۔ میں ذرا اس سے بات کر لوں۔"

ارشد عورت کے ساتھ چلا گیا۔ اسلم کمرے میں اکیلا رہ گیا۔ ڈیوڑھی کے ساتھ ہی مختصر سا کمرہ تھا۔ زمین پر چاندنی بچھی تھی۔ کونے میں پرانے سے میلے میلے صوفے لگے تھے۔ دیوار پر ایک نیم عریاں عورت کی تصویر لگی تھی۔ باہر جا کر ارشد نے عورت کو سمجھایا کہ اس کا دوست نیا نیا شکاری ہے۔ بڑا شرمیلا ہے۔ زیادہ لڑکیوں کو دیکھ کر گھبرا جائے گا۔ بہتر یہی ہے کہ اسی کمرہ میں ایک لڑکی بھوا دی جائے۔ میں دوسرے کمرے میں بیٹھ جاؤں گا۔

"جیسے تمہاری مرضی۔"

ارشد نے عورت کو دس دس کے چار نوٹ دیئے۔ عورت نے خوش ہو کر نوٹ پکڑ لیئے اور ارشد کو لے کر دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ جس کمرے میں اسلم بے چینی سے بیٹھا در و دیوار کو تک رہا تھا۔ اس کے ساتھ والے تیسرے کمرے میں سلمہ عرف نیلم بستر پر نیم دراز چائے پی رہی تھی۔ اس کے سر میں معمولی سا درد تھا۔ ارشد نے عورت کو خاص طور پر تاکید کی تھی کہ اس کے دوست کے پاس نیلم کو بھجوا دیا جائے۔ کیونکہ ان سب لڑکیوں میں نیلم ہی ایک ذرا پڑھی لکھی اور جسم کی اچھی لڑکی تھی۔ نیلم کی روحانی صحت صفر کے برابر تھی۔ مگر اس کا جسم یہاں رہ کر بھر گیا تھا اور وہ بوجھل ہو گئی تھی۔ ایسی عورتوں کو عیاش آدمی بہت پسند کیا کرتے ہیں۔ یہی وجہ تھی کہ نیلم ان لڑکیوں میں صوفیہ لورین کے نام سے مشہور تھی۔ عورت نے نیلم کے کمرے میں جا کر اسے تیار ہو جانے کو کہا۔ نیلم نے منہ بنا کر کہا۔

"میری طبیعت ٹھیک نہیں۔"

"بکواس بند کرو۔ گھڑی دو گھڑی کی بات ہے میں نے وعدہ کر لیا ہے۔ چلو جلدی سے اٹھ کر تیار ہو جاؤ۔ دوسرے کمرے میں تمہارا انتظار ہو رہا ہے۔"

نیلم دل ہی دل میں اس عورت کو گالیاں دیتی بستر پر سے اٹھی۔ گرم پانی سے منہ ہاتھ دھویا۔ کپڑے بدلے۔ میک اپ کیا۔ بال ماتھے پر گرائے۔ آنکھوں میں سرما لگایا۔ ہونٹوں پر سرخی جمائی اور دوپٹہ گلے میں ڈال کر نیم عریاں سینہ لئے اس کمرے کی طرف چل پڑی جس کمرے میں اسلم بیٹھا ہوا تھا۔

اسلم بیٹھا بور ہو گیا تھا اور دو تین سگریٹ پھونک چکا تھا۔ کئی بار اس نے سوچا کہ اٹھ کر بھاگ جائے۔ موٹر کی چابی اس کے پاس تھی۔ پھر یہ سوچ کر بیٹھا رہا ارشد برا مان جائے گا۔ اسے پیدل واپس آنا پڑے گا۔ اتنی رات کو یہاں سے تو تانگہ بھی نہ مل سکے گا۔ وہ جس رخ پھر بیٹھا تھا۔ اس کی پشت دروازے کی طرف تھی۔ اچانک اسے دروازہ کھلنے اور پھر بند ہونے کی

آواز آئی۔ اس نے بالکل مڑ کر نہ دیکھا۔ وہ سمجھ گیا کہ وہی عورت ہو گی اور اس کی چاپلوسی کرنے آئی ہو گی۔ سلمہ یعنی نیلم نے اندر داخل ہو کر دروازہ بند کر لیا۔"

"میں اندر آ سکتی ہوں؟"

اسلم نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ سمجھ گیا کہ کوئی پیشہ ور لڑکی داخل ہوئی ہے لیکن اسے کچھ یوں لگا جیسے اس نے یہ ہی آواز کہیں پہلے بھی سنی ہے۔ نیلم بڑے انداز سے قدم قدم چلتی اسلم کے پیچھے آن کر کھڑی ہو گئی۔

"میں سگریٹ پی سکتی ہوں؟"

اسلم نے سگریٹ کی ڈبیا اس کی طرف کر دی۔

"سلگایئے گا نہیں؟"

اسلم نے دیا سلائی جلا کر نیلم کی طرف کی تو دیا سلائی اس کے ہاتھ میں جلتی کی جلتی رہ گئی۔ نیلم نے اسلم کو دیکھا تو دھک سے رہ گئی۔ اس کا دل اس کے حلق کے قریب آ کر دھڑکنے لگ گیا۔ اس کی ٹانگوں میں سے جان ہی نکل گئی۔ کانوں میں بھی آندھیوں کی طرح شور انگیز سیٹیاں بجنی شروع ہو گئیں۔ اس کا رنگ زرد ہو کر اڑ گیا۔ اسلم کرسی پر سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا

"سلمہ تم؟"

سلمہ نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ اپنے آپ ہی کچھ سمٹ کر کچھ سکڑ کر زمین پر بیٹھ گئی اور اپنا سر اسلم کے قدموں میں رکھ دیا۔ اسلم بت کا بت بنا کھڑا رہا۔ اس کا سارا جسم کانپ رہا تھا اور حلق میں کانٹے پڑ گئے تھے۔ ماتھے پر ہتھوڑے سے چل رہے تھے۔ پھر اس نے جھک کر سلمہ کو اٹھانا چاہا مگر سلمہ پتھر بن کر زمین پر گری پڑی تھی۔ اس کا بدن لرز رہا تھا۔ کانپ رہا تھا۔ وہ یوں پڑی تھی جس طرح اہرام مصر کے تودے پڑے ہوتے ہیں۔

"یہ کیا ہو گیا سلمہ؟ میں کیا دیکھ رہا ہوں؟ کیا یہ تباہی ابھی دیکھنا باقی تھی؟"

اسلم نے جھک کر سلمہ کا چہرہ بڑی مشکل سے اوپر اٹھایا۔ اس کی آنکھیں اندر کو بھنچی ہوئی تھیں اور گالوں پر آنسوؤں کی ندیاں رواں تھیں اور بدن پر سسکیوں کے ساتھ لرزا طاری تھا۔ یہ وہ پہلے والی سلمہ نہ رہی تھی۔ رنگ سانولا ہو گیا تھا۔ آنکھوں کے نیچے سیاہ حلقے پڑ گئے تھے۔ رخساروں پر چھائیاں نمودار ہو گئی تھیں۔ اسلم پیچھے ہٹ کر کھڑا ہو گیا۔ سلمہ وہیں پڑی سسکتی رہی۔ اسلم کا دماغ گھوم رہا تھا۔ وہ فوراً صوفے کا سارا

لے کر صوفے پر گر پڑا - سلمہ اٹھی اور باہر کو بھاگنے لگی - اسلم نے لپک کر اسے پکڑ لیا - سلمہ اٹھی اور باہر کو بھاگنے لگی - اسلم نے لپک کر اسے پکڑ لیا - اسلم نے لپک کر اسے پکڑ لیا- سلمہ نے منہ دوسری طرف کر لیا اور روتے ہوئے کہا-

" میں مرچکی ہوں - میں مرچکی ہوں- سلمہ مرچکی ہے - خدا کے لئے مجھے میرے حال پر چھوڑ دو- میں اب تم لوگوں کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہی- "

اسلم نے اسے سامنے بٹھلا لیا- دروازے کو اندر سے بند کر دیا اور کمرے میں پاگلوں کی طرح چکر کاٹنے لگا - پھر کانپتی ہوئی آواز میں بولا -

" ٹھیک ہے تم مرچکی ہو - سلمہ مرگئی ہے - مگر میں سلمہ کی لاش ان گدھوں کے حوالے نہیں کر سکتا - میں اس کی لاش اپنے ساتھ لے جاؤں گا ------- چلو میرے ساتھ یہاں سے نکل چلو - جلدی کرو- میری گاڑی باہر کھڑی ہے -"

سلمہ کے سامنے ایک بجلی سی لہرا گئی - اس نے چہرہ اوپر اٹھا کر اپنے چاروں طرف دیکھا - اسے یوں لگا جیسے سالہا سال کے انتظار کے بعد اسے نجات دینے والا آگیا ہو- اس نے لپک کر دروازہ کھول کر باہر دیکھا - اسلم جلدی سے اس کے پاس آگیا- اسکا ہاتھ پکڑا اور اسے ساتھ لیکر کمرے سے باہر نکل آیا - صحن میں اس وقت کوئی بھی نہ تھا- ساتھ والے کمرے میں روشنی ہو رہی تھی - اور ارشد کی باتوں کی آواز آ رہی تھی- اسلم تیزی سے سلمہ کو ساتھ لیکر ڈیوڑھی میں سے گزر گیا - باہر کھیتوں اور راستوں پر دھواں پھیلا ہوا تھا- سردی میں سڑک سنسان تھی - گاڑی ذرا فاصلے پر کھیت کے کنارے کھڑی تھی - اسلم نے گاڑی کا دروازہ کھول دیا - سلمہ جلدی سے اندر داخل ہو گئی - اسلم بھی سوار ہو گیا - اس نے دروازہ بند کیا - گاڑی کا انجن سٹارٹ کیا - اسے گھما کر واپس موڑا اور ایک ہی جھٹکے کے ساتھ گاڑی کو لے کر شہر کو جانے والی سڑک پر روانہ ہو گیا -

گاڑی شہر کے مختلف علاقوں میں سے گزرتی گئی - اس دوران میں ان دونوں میں سے کسی نے کوئی بات نہ کی - اسلم کا چہرہ بے حد سنجیدہ تھا اور اس کے ہونٹ بڑے کرب ناک انداز کو سمٹے ہوئے تھے - پچھلی نشست پر بیٹھی سلمہ کا بھی یہی حال تھا -

اس نے سر جھکا رکھا تھا - رومال سے مل کر سارا میک اپ اتار دیا تھا - وہ روئے جا رہی تھی اور سوچے جا رہی تھی کہ اگر اسے اسلم سے ملنا ہی تھا تو وہ اس بے حیا زندگی میں کیوں آئی- اور اگر آگئی تھی تو اسے اسلم کیوں ملا- ہائے اللہ یہ کیا ہو گیا - وہ کیا کیا نہیں سوچتا ہو گا- اس کا ذہن عجیب تضاد میں تھا - کبھی نیک اور باحیا سلمہ سامنے آ جاتی اور کبھی بے حیا نیلم غلبہ پا جاتی - وہ غم سے نیم جان ہو گئی تھی اور ایک ہی پل میں اس کا جسم یوں گھٹ گیا تھا جیسے برسوں کی بیمار ہو -

شہر سے باہر ایک بڑے خوبصورت ہوٹل کے احاطے میں کار داخل ہو گئی - اسلم نے سلمہ کو گاڑی میں ہی رکھا - خود اندر چلا گیا - سلمہ نے سوچا کہ وہاں سے بھاگ جائے - وہ اسلم کو کیا منہ دکھا رہی ہے ؟ کیا وہ اس قابل ہے کہ اسلم سے کوئی بات کر سکے ؟ نہیں نہیں اسے بھاگ جانا چاہئے- وہ اٹھنے کو پر تولنے لگی - پھر ایک دوسرا خیال بیدار ہو گیا - ایسا نہ کرنا سلمہ ! تمہیں گناہ کی زندگی سے نجات مل رہی ہے - تمہیں خدا نے ایک بار پھر نیک زندگی بسر کرنے کا موقع دیا ہے - اسلم کے پاؤں پر گر کر معافی مانگ لینا - وہ تمہارا اپنا ہے - وہ تمہیں معاف کر دے گا - اسے ساری داستان صاف صاف سنا دینا - سچی بات کا اس پر ضرور اثر ہو گا - وہ تمہیں ضرور معاف کر دے گا - گندگی سے نکل کر پھر اس کی طرف مت دوڑو - اگر تم وہاں چلی گئیں تو وہاں تمہاری زندگی کا کیا انجام ہو گا ؟ یہی ناں کہ ایک روز تم بیماریوں کی پوٹ بن کر کسی کوٹھڑی میں لیٹ کر کھانس کھانس کر موت کا انتظار کیا کرو گی اور موت تم سے کوسوں دور ہو گی - کوئی تمہارے منہ میں پانی ڈالنے والا بھی نہ ہو گا -

اسلم دوبارہ نمودار ہوا - اس نے گاڑی کا دروازہ کھول کر کہا -

" میرے پیچھے پیچھے چلی آؤ -"

وہ سلمہ کو لیکر ہوٹل کے چمکیلے برآمدے میں سے گزرتا ایک کمرے کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گیا - کمرہ سجا ہوا تھا - اور دیوار کے ساتھ ایک پلنگ بھی لگا تھا - زمین پر قالین بچھا تھا

" یہ رات تمہیں یہاں بسر کرنی ہو گی - گھبرانا نہیں - میں صبح آؤں گا - باقی سب باتیں صبح ہوں گی - یہاں سے پھر کسی جگہ جانے کی کوشش نہ کرنا اور اگر تم چلی گئی تو مجھے بہت صدمہ ہو گا - پھر شاید میں بھی اس شہر کو ہمیشہ کے لئے چھوڑ دوں - اور میں یہ شہر نہیں چھوڑ سکتا - میری یہاں کچھ ذمہ داریاں ہیں - اب میں جاتا ہوں -"

اتنا کہہ کر اسلم چپکے سے دروازہ کھول کر باہر چلا گیا - سلمہ کچھ دیر بت بنی بیٹھی رہی - پھر اس نے اٹھ کر دروازہ بند کر کے چٹخنی لگا دی - اور پلنگ پر بیٹھ کر سوچنے لگی کہ یہ کیا ہو گیا - یہ اچانک کیسا انقلاب آگیا - وہ کہاں سے کہاں پہنچ گئی - اس نے پلنگ پر لیٹ کر سونے کی کوشش کی مگر نیند کہیں نہیں آ رہی تھی - اس نے وقت دیکھا - رات کے ساڑھے بارہ بج رہے تھے- سلمہ نے بتی گل کر دی - پلنگ پر اوندھے منہ لیٹ گئی - جانے اسے کیا خیال آیا کہ اس کی چیخ نکل گئی اور وہ بچوں کی طرح بلک بلک کر رونے لگی اور روتی رہی ' روتی رہی -

سویرے اٹھ کر اسلم گاڑی لے کر سیدھا بازار گیا - وہاں جا کر اس نے سلمہ کے لئے شریفانہ طرز کی ایک قمیض اور ایک سیاہ برقعہ خریدا اور وہاں سے سیدھا اس ہوٹل میں آگیا جہاں رات کو وہ سلمہ کو چھوڑ گیا تھا - گاڑی احاطے میں کھڑی کر کے اس نے کپڑے کا بنڈل ہاتھ میں لیا اور

برآمدے میں سے ہو کر اس کمرے میں آ گیا۔ کمرے کا دروازہ اندر سے کھلا ملا۔ اسلم اندر داخل ہو گیا مگر سلمہ اندر نہیں تھی ۔ اس نے غسل خانے پر دستک دی ۔ غسل خانے کا دروازہ بھی کھل گیا۔ وہاں بھی کوئی نہیں تھا ۔ اچانک اس کی نظر آتش دان پر پڑ گئی ۔ وہاں گلدان الٹا پڑا تھا ۔ اس نے گلدان اٹھایا تو اس کے نیچے ایک خط تہہ کئے رکھا تھا ۔ اسلم نے کاغذ کھول کر پڑھنا شروع کر دیا ۔

" ---------- میں جا رہی ہوں ۔ اس لئے نہیں کہ میں جانا چاہتی ہوں ۔ بلکہ اس لئے کہ میں اب تم لوگوں کے ساتھ نہیں رہ سکتی ۔ ذرا سوچو۔ تم نے مجھے جس حالت میں اور جس ماحول میں دیکھ لیا ہے ۔ اب میں تم سے کبھی آنکھیں چار کر سکتی ہوں ؟ میں وہ سلمہ نہیں ہوں ۔ تمہیں مجھ پر دھوکا ہوا تھا ۔ میں اپنی نئی زندگی میں بڑی مطمئین تھی کہ تم نے آ کر میرا سکون بھی برباد کر دیا ۔ تم نے مجھے میری وہ تصویر دکھلا دی جسے میں اب کبھی دیکھنا گوارا نہیں کر سکتی ۔ میرا راستہ میری منزل تم لوگوں سے جدا ہے ۔ اگر سلمہ زندہ ہوتی تو تمہارے ساتھ ضرور آ جاتی ۔ مگر سلمہ مر گئی ہے۔ اور تم وہاں سے نیلم کو اٹھا لائے تھے ۔ نیلم کبھی کسی کے ساتھ نہیں رہ سکتی ۔ وہ کبھی اپنی موجودہ زندگی کو نہیں چھوڑ سکتی ۔ خدا کے لئے مجھے تلاش کرنے کی بالکل کوشش نہ کرنا ۔ میں تمہیں کبھی نہ مل سکوں گی ۔ میں اس شہر کو چھوڑ کر کسی دوسرے شہر میں جا رہی ہوں ۔ اگر تم وہاں بھی میری تلاش میں آ گئے تو میں تمہیں پہچاننے سے انکار کر دوں گی ۔ اس لئے کہ میں زندہ رہنا چاہتی ہوں۔ اور تم مجھے زہر دینا چاہتے ہو ۔ اس زندگی سے الگ ہو کر تمہارے پاس دو ہی دن میں اندر ہی اندر گھل کر ختم ہو جاؤں گی ۔ مجھے تو ایک ہی رات نے اتنا ادھ موا کر دیا ہے کہ میں شاید ایک ماہ تک بستر سے نہ اٹھ سکوں گی ۔ خدا حافظ ! سلمہ کو بھول جانا ۔ جس طرح تم اپنے ماں باپ کو بھول گئے تھے ۔ وہ ماں جو مر چکی ہے ۔ وہ باپ جس کی کسی کو خبر نہیں ۔ میں جا رہی ہوں ' موت کی طرف ---- "

نیلم

(جو کبھی سلمہ تھی)

اسلم خط پڑھ کر حیران رہ گیا ۔ یہ بات بالکل خلاف توقع ہو گئی تھی ۔ اسے کسی طرح بھی یقین نہیں آ رہا تھا کہ سلمہ اس طرح واپس اپنی گناہ آلود زندگی میں داخل ہو جائے گی۔ اسے سلمہ کے واپس چلے جانے پر بے حد صدمہ ہوا ۔ مگر اب خاموش رہنے اور دل ہی دل میں اس صدمے کو چپکے سے برداشت کر جانے کے وہ اور کچھ نہیں کر سکتا تھا ۔ اس نے ہوٹل کے دفتر میں آ کر بل ادا کیا اور واپس گھر آ گیا ۔

دوسری شام کو ارشد سے ملاقات ہو گئی ۔ ارشد نے بڑا گلہ کیا ۔ کہنے لگا۔

" یار اسلم ! اگر تم وہاں نہیں بیٹھنا چاہتے تھے اور نیلم کے ساتھ کہیں باہر رات گذارنا چاہتے تھے تو ہمیں کہہ دیا ہوتا ۔ تم بڑی خاموشی سے اسے لے کر چل دیئے ۔ وہ لوگ تو حیران رہ گئے مگر خیر جب صبح کو نیلم آ گئی تو انہوں نے خدا کا شکر ادا کیا ۔ تم نے تو اس کا حلیہ بگاڑ دیا تھا ۔ وہ تو بڑی بیمار ہو رہی تھی ۔ بے چاری آج اس شہر سے چلی گئی ہے ۔ "

اسلم نے نظریں جھکائے ہوئے پوچھا ۔

" کس شہر گئی ہے ؟"

" خدا جانے ----- مگر تمہیں اس سے محبت ہو گئی ہے کیا ؟"

" کچھ نہیں ۔ "

اتنا کہہ کر اسلم ارشد کے پاس سے اٹھ کر چلا گیا اور اس کے بعد ارشد کی کوشش کے باوجود اسے نہ ملا ۔ ایک روز ملاقات ہوئی تو اسلم نے کہا کہ وہ سوشل زندگی سے بیزار ہو گیا ہے ۔ اور تنہائی میں رہنا چاہتا ہے۔ اس لئے اسے تنگ نہ کیا جائے ۔ ارشد اس کا منہ ہی دیکھتا رہ گیا ۔

اس رات کوئی نصف شب گزر جانے پر اسلم اپنے بستر پر سے اٹھا اور سگریٹ سلگا کر کمرے میں ٹہلنے لگا ۔ کوئی آدھ گھنٹہ بعد بے چینی سے ادھر ادھر پھرنے کے بعد اس نے چھٹا سگریٹ ایش ٹرے میں بجھایا اور اپنے کمرے سے باہر نکل کر یاسمین کے کمرے کی طرف چل دیا

یاسمین گہری نیند میں سو رہی تھی۔ اسلم آہستہ سے اس کے کمرے میں داخل ہو گیا ۔ اس نے یاسمین کو کندھے سے آہستہ سے ہلا کر جگایا ۔ یاسمین نے آنکھیں کھول دیں اور حیرانی سے پوچھا ۔

" خیریت ؟"

" ہاں یاسمین ! میں تم سے ایک ضروری بات کرنے آیا ہوں۔ "

یاسمین آنکھیں ملتی ہوئی اٹھ بیٹھی۔ اسلم اس کے سامنے کرسی پر بیٹھ گیا ۔ یاسمین نے پوچھا ۔

" خیریت تو ہے نا ؟"

اسلم نے یاسمین کی طرف بڑی اداس نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا ۔

" یاسمین میں تم سے بہت جلد شادی کرنا چاہتا ہوں ۔"

یاسمین نے یہ سن کر سر جھکا لیا ۔ کندھے پر شال ڈال لی اور منہ سے کچھ نہ بولی۔ اسلم نے جیب سے سگریٹ کیس نکال کر سگریٹ سلگایا ۔ کچھ دیر زمین پر بچھے ہوئے قالین کو دیکھتا رہا ۔ پھر آہستہ سے بولا ۔

" میری زندگی ایک ایسے آدمی کی زندگی ہے یاسمین ! جیسے لق و دق صحرا کے ایک چھوٹے سے نخلستان میں جلا وطن کر دیا ہو- میرے چاروں طرف ہزاروں میل میں جھلستا ہوا ریگستان پھیلا ہوا ہے - میری زندگی اور خوشیوں کا دار ومدار صرف اس نخلستان کے ایک چھوٹے سے پانی کے تالاب پر ہے جو روز بروز دھوپ کی تمازت میں خشک ہوتا جا رہا ہے - اس سے پیشتر کہ یہ نخلستان بھی لق و دق صحرا کی صورت میں بدل جائے ' میں تم سے شادی کر کے اپنی ایک الگ دنیا ' ایک الگ گھر بسانا چاہتا ہوں - تم میری زندگی کی آخری منزل ہو - تم ہی وہ روشنی کا مینار ہو جس کی روشنی میں میں اپنے مستقبل کے اندھیروں میں راستہ بنا رہا ہوں - مجھے بتاؤ میں اس سلسلے میں تمہارے ڈیڈی سے بات کروں یا تم خود کرو گی ؟"

یاسمین نے کہا -

" میں خود کیسے بات کر سکتی ہوں - میں اتنا ہی کر سکتی ہوں کہ جب وہ مجھ سے بات کریں تو میں انہیں کہہ دوں کہ میں اسلم کو چاہتی ہوں - اور صرف اسی سے بیاہ کرنا چاہتی ہوں اور کسی دوسرے آدمی کو اپنی زندگی میں داخل نہیں کرنا چاہتی -"

اسلم کہنے لگا -

کیا تم سمجھتی ہو کہ ڈیڈی میری بات مان لیں گے ؟"

" میں کیا کہہ سکتی ہوں لیکن ڈیڈی بڑے اچھے اور ہمدرد باپ ہیں - وہ مجھ سے بڑی محبت کرتے ہیں - وہ خوشی کی خاطر سب کچھ گوارا کر لیں گے اور پھر وہ تمہیں بڑا بھی بڑا اچھا سمجھتے ہیں اور تم سے بھی بڑا پیار کرتے ہیں -"

اسلم انگلیاں چٹخانے لگا -

" کاش ! میں کسی طرح انہیں یقین دلا سکوں کہ میں یاسمین سے کس قدر محبت کرتا ہوں اور اس کی خوشی اور سکون کے لئے میں کیا کچھ نہیں کر سکتا - میں تمہارے لئے مزدوری بھی کرنے کو تیار ہوں یاسمین ! یہ حقیقت ہے کہ میں نے زندگی میں بھی کسی سے اتنی محبت نہیں کی اور نہ کبھی کسی سے اتنی محبت کر سکتا ہوں -"

یاسمین بولی -

" تم ان سے بات کر کے تو دیکھو -"

" اچھا صبح ان سے بات کروں گا- اب تم آرام کرو -"

اسلم نے اٹھتے ہوئے یاسمین کے ماتھے پر بوسہ دیا اور چپکے سے اس کے کمرے سے باہر نکل آیا - اور سر جھکائے اپنے کمرے میں جا کر بستر پر لیٹ گیا - عین اس وقت یاسمین کا ڈیڈی باہر کھڑا ان دونوں کی باتیں سن رہا تھا - جب اسلم خواب گاہ میں جا کر سو گیا تو یاسمین کا ڈیڈی

سر جھکائے قدم اٹھاتا اپنی خواب گاہ میں آ گیا - یاسمین اسے بہت عزیز تھی - وہ اس کی اکلوتی اولاد تھی - بیوی کی وفات کے بعد اس شخص کی زندگی میں صرف یاسمین کی وجہ سے ہی کچھ رونق اور زندگی باقی تھی - وہ نہیں چاہتے تھے کہ یاسمین کی زندگی کسی طرح سے بھی پریشانی میں گزرے اور اسے آگے چل کر کسی قسم کی بھی مصیبت کا سامنا کرنا پڑے - وہ جانتے تھے کہ وہ دونوں ایک دوسرے سے بے حد پیار کرتے ہیں - وہ اسلم کی شرافت کی نفس کے بھی بے حد قائل تھے - اپنی خوابگاہ میں جا کر وہ بستر میں لیٹے - کتنی ہی دیر تک وہ سوچتے رہے کہ اسلم سے یاسمین کی شادی کر دینے پر کیا کیا قباحتیں پیدا ہو سکتی ہیں - اور اگر انہوں نے انکار کر دیا تو یاسمین کو کس حد تک صدمہ ہو سکتا ہے - اسلم کے ساتھ یاسمین کو بیاہ دینے سے سب سے بڑا فائدہ یہ تھا کہ اس طرح یاسمین ان کے گھر میں ہی رہ سکتی تھی - باقی رہی یہ بات کہ اسلم بے کار تھا تو اس کا بندوبست بھی کیا جا سکتا تھا - اسے مزید تعلیم دلوائی جا سکتی تھی - اسے کسی کاروبار میں بھی لگوایا جا سکتا تھا -

صبح ہو گئی - یاسمین کے ڈیڈی دفتر چلے گئے - شام کو واپس آئے تو اسلم نے کھانے کے بعد ان کے پاس بیٹھ کر ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگا- یاسمین کے ڈیڈی کو معلوم تھا کہ وہ ان سے کیا کہنا چاہتا ہے - لیکن ان کی خواہش تھی کہ وہ خود پوچھنے کی بجائے اسلم اپنی زبان سے اظہار مدعا کرے - اسلم سوچ رہا تھا کہ بات کہاں سے شروع کرے -

بڑی مشکل کے بعد اسلم نے بات شروع کر دی اور ڈیڈی سے بڑی لجاجت اور ادب سے کہا کہ وہ یاسمین سے بیاہ کر کے ان کی دامادی کا شرف حاصل کرنا چاہتا ہے - جیلر صاحب نے اس کا کوئی جواب نہ دیا -اور خاموش ہو گئے - کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد وہ اٹھ کھڑے ہوئے اور بولے -

" پھر بات ہو گی اسلم -------- خدا حافظ !"

اسلم ان کا منہ ہی دیکھتا رہ گیا - ایک روز ' دو روز ' تین روز گزر گئے مگر ڈیڈی نے اسلم سے کوئی بات نہ کی - اسلم حیران تھا - اس نے یاسمین سے مشورہ کیا - یاسمین نے کہا -

" ہمت مت ہارو - وہ تم سے ضرور بات کریں گے -"

چوتھے کھانے کے بعد یاسمین کے ڈیڈی نے اسلم کو بلایا اور سامنے بٹھلا کر اس سے گفتگو شروع کر دی- انہوں نے ہر طرح کے سوال کر کے اسلم کا امتحان لیا اور اندازہ کیا کہ وہ شادی کی تجویز میں کس حد تک مخلص ہے اور یاسمین کے لئے کہاں تک صحیح خاوند ثابت ہو سکتا ہے -

وہ اسلم کی باتوں سے بہت متاثر ہوئے - اسلم نے انہیں صاف صاف کہہ دیا کہ وہ یاسمین سے پیار کرتا ہے - اور اس سے شادی کر کے باقی ماندہ زندگی ایک شریف اور محنتی انسان کی طرح بسر کرنا چاہتا ہے - وہ محبت ' ایثار ' محنت اور شرافت کے ساتھ اپنی گزشتہ زندگی کے تمام داغوں کو

دھو ڈالنا چاہتا ہے - وہ یاسمین کی خوشی کی خاطر بڑی سے بڑی قربانی دینے کو تیار ہے اور اگر انہوں نے اسے اپنی فرزندی میں لینے سے انکار کر دیا تو وہ آج کی رات ہی چپکے سے ان سے جدا ہو جائے گا اور پھر کبھی انہیں اپنی شکل نہیں دکھائے گا اور کسی سے اپنی پرانی زندگی کے بارے میں کبھی کوئی ذکر نہیں کرے گا- یاسمین کے ڈیڈی نے تمام باتوں پر اچھی طرح غور وخوض کرنے بعد کہا -

" میں تمہیں کل اپنا جواب دوں گا - اسلم ! اب تم جاکر سو جاؤ-"

اسلم نے شب بخیر کہا اور اپنے کمرے میں آ کر لیٹ گیا- اس رات یاسمین کے ڈیڈی نے یاسمین کو اپنے کمرے میں بلا کر اس کو ساری باتیں بتادیں اور پوچھا-

" دیکھو بیٹی! میں نے تمہیں بڑے ناز و نعم اور بڑے آزاد ماحول میں پالا پوسا ہے-میں نے تمہاری تربیت اس طرح کی ہے کہ تم زندگی میں برے بھلے کی پہچان کر سکو - اب جو مرحلہ مجھے در پیش ہے - اس کے بارے میں تم کیا سوچتی ہو - کیا تم دل سے نہیں بلکہ دماغ سے یہ محسوس کرتی ہو کہ تم اس جگہ شادی کر کے خوش رہو گی - "

یاسمین نے سر جھکا رکھا تھا - اس نے کوئی جواب نہ دیا - ڈیڈی نے اس کے سر پر ہاتھ پھیر کر کہا -

"بیٹی ! یہ تمہاری زندگی کا معاملہ ہے - اس اعتبار سے بڑا نازک معاملہ ہے - اس وقت کی بے جا شرم اور خاموشی تمہاری پوری زندگی پر اثرانداز ہو سکتی ہے- اس لئے بہتر ہے کہ اپنی زبان سے میرے خدشات دور کرنے کی کوشش کرو - کیا تم واقعی یہ سمجھتی ہو کہ اسلم سے شادی کر کے تم زندگی کے کسی بھی مرحلے پر پچھتاؤ گی نہیں - سماج کی نظروں میں وہ ایک سابق قیدی ہے جس نے ایک عورت کو قتل کرنے کی کوشش کی تھی - اس کی بیکاری کوئی بڑا مسئلہ نہیں- وہ دور کر دی جائے گی - کیا تم اس کی عادتوں کو پوری طرح سمجھ گئی ہو؟ اس کی کمزوریوں سے پوری طرح واقف ہو - اور ان تمام حقائق کو سامنے رکھتے ہوئے تم پھر بھی محسوس کرتی ہو کہ تم جو کچھ کر رہی ہو ' وہ ٹھیک اور مناسب ہے؟"

یاسمین نے آہستہ سے کہا -

" ہاں ڈیڈی ----- میں نے اس مسئلے پر کافی سوچ بچار کی ہے - ہم دونوں شادی کے بعد بے حد خوش اور مطمئن رہیں گے - مجھے سوائے اپنے جیون ساتھی کے اور کسی سے کوئی مطلب نہیں ہو گا- اسلم میری بے حد عزت کرتے ہیں اور انہیں میری دکھ درد کا بیحد احساس ہے -"

" ایک بار پھر سوچ لو بیٹی ! میں تو جس طرح تم کہو گی ' ویسے ہی کر دوں گا- کیونکہ مجھے

تمہاری خوشی منظور ہے- میں تمہیں زندگی میں خوش و خرم دیکھنا چاہتا ہوں- لیکن اگر بعد میں ذرا سی بھی تکلیف پہنچی تو میں جیتے جی مر جاؤں گا-"

یاسمین نے آہستہ سے کہا-

" ڈیڈی! مستقبل تو خدا کے ہاتھ میں ہے لیکن میں اتنا جانتی ہوں کہ اسلم ہی وہ انسان ہے جو اگر کبھی ایسا وقت آیا تو میری خاطر اپنی جان کی بازی لگا دے گا-"

" اچھا بیٹی! اگر تم اسی میں راضی ہو تو مجھے کیسے انکار ہو سکتا ہے - خدا تم دونوں کو سکون اور نیکی دے-"

ڈیڈی نے یاسمین نے سر پر پیار کیا- یاسمین آداب کہہ کر باہر نکل گئی- اپنے کمرے میں آ کر اس نے خوشی سے اسلم کی تصویر کو چوم لیا اور سینے سے لگا کر آنکھیں بند کر لیں-

دوسرے دن ڈیڈی نے اسلم کو بھی اپنے فیصلے سے آگاہ کر دیا اور اس کے سر پر پیار سے ہاتھ پھیرا- اسلم کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ ہی نہ رہا تھا- اس کی زندگی میں بیداری اور مسرت کی نئی لہر دوڑ گئی تھی- یاسمین کے باپ نے سوچا کہ جب شادی کی بات طے ہو گئی ہے تو اس کام میں دیر نہیں کرنی چاہئے- کیونکہ لڑکا لڑکی ایک ہی گھر میں رہتے ہیں- چنانچہ انہوں نے تین دن بعد شادی کا دن مقرر کر دیا- کراچی اور ڈھاکہ اور پشاور سے جیلر صاحب کے رشتہ دار ایک دو روز پہلے ہی کوٹھی پہنچ گئے-

یاسمین کی رشتہ دار لڑکیوں' سہیلیوں اور خاص طور پر نجمی نے رات کو ڈھولک پر خوشی کے گیت گانے شروع کر دیئے- کوٹھی کو رنگ برنگ جھنڈیوں اور لال پیلے برقی قمقموں سے سجا دیا گیا- اسلم اپنے دوستوں کے ساتھ کسی ہوٹل ملیں بیٹھا انہیں دعوت کھلا رہا تھا- یاسمین گھر میں بیٹھی اپنی سہیلیوں کے مذاق کا نشانہ بنی ہوئی تھی- نجمی نے کہا-

" آج تو منہ میں گھنگنیاں پڑی ہیں اور کل لڈو پھوٹ رہے ہوں گے-"

دوسری بولی-

"کیوں نہیں- تمہارے ساتھ بھی یہی ہو گی- فکر نہ کرو-"

" بھئی ہم تو شادی نہیں کرائیں گے-"

"تم نہیں کرو گی تو کوئی دوسرا تم سے خود ہی کر لے گا-"

سب قہقہے لگا کر ہنس پڑیں- یاسمین بیحد خوش تھی- اگرچہ اس نے معمولی کپڑے پہن رکھے تھے - پھر بھی اس کے چہرے پر مسرت کی روشنی چمک رہی تھی-

ادھر ہنستے مسکراتے خوش فکرے دوستوں کی محفل میں بیٹھے بیٹھے اچانک اسلم کا چہرہ ادا ہو گیا- اسے اپنی مرحوم ماں اور مفرور باپ یاد آ گئے- اگر آج وہ اس کے پاس ہوتے تو انہ

کتنی خوشی ہوتی لیکن ان میں سے کوئی بھی اسلم کی خوشیوں کا میں حصہ لینے کے لئے وہاں نہیں تھا۔ ماں مصیبت زدہ زندگی کی ٹھوکریں کھانے کے بعد اللہ کو پیاری ہو گئی تھی اور باپ خدا جانے کس جنگل میں، کس صحرا میں، کس گمنام حصہ زمین میں درد کی ٹھوکریں کھا رہا تھا۔ زندہ بھی تھا یا نہیں! اسلم کو کوئی خبر نہیں تھی۔ پھر اسے سلمہ کا خیال آگیا جو اس سے محبت کرتی تھی۔ اسکی کتابوں کو سلیقے سے لگایا کرتی تھی۔ اس کے کپڑے استری کیا کرتی تھی۔ اس کے جوتے تک پالش کر لیا کرتی تھی۔ رات کو روز اس کے لئے دودھ لایا کرتی تھی۔ آدھی آدھی رات تک بیٹھ کر اس کے اشعار کاپی میں نقل کیا کرتی تھی۔ مگر جو اس کنبے کے ساتھ ہی تباہ ہو گئی۔ اور آج ایک بازاری عورت کی گھناؤنی زندگی بسر کر رہی تھی۔ جسے آج کوئی اپنی بہن اور بیوی کہنے کے لئے تیار نہیں تھا۔ جس کے ہاتھ اب کبھی پیلے نہیں ہوں گے۔ جس کے سر پر کوئی سسر اور کوئی باپ پیار سے ہاتھ نہیں رکھے گا۔ جسے کبھی شادی کا سرخ جوڑا نصیب نہیں ہو گا۔ کبھی کوئی گھوڑے پر سوار ہو کر اسے بیاہنے نہیں آئے گا۔ وہ ایک طویل کنواری بیوگی کی زندگی بسر کرتی چلی جائے گی۔ اور جب موت آئے گی تو اسے ہڈیوں کا ڈھیر بنی کسی سڑک کے کنارے گندگی کے ڈھیر پر کھانستی ہوئی پائے گی۔ اسلم کے چہرے پر پریشانی کے آثار دیکھ کر اس کے دوستوں نے کہا۔

"بھئی تم کہاں گم ہو گئے؟"

اسلم ایک دم چونک پڑا اور موقعہ کی نزاکت کا احساس کر کے فوراً دوسرے دوستوں کے ساتھ ہنسنے اور مسکرانے لگا اور ان کی فقرہ بازیوں میں شریک ہو گیا۔ لیکن اس کی مسکراہٹوں کی تہہ میں غم کی ہلکی سی چیخ صاف سنائی دے رہی تھی۔ جب دعوت ختم ہو گئی اور اسلم کے سارے دوست اس سے دوسرے روز برات پر آنے کا وعدہ کر کے رخصت ہو گئے تو اسلم گاڑی میں بیٹھا اور کسی پراسرار قوت کے زیرِ اثر اس علاقے کی طرف چل پڑا جدھر کبھی انکی کوٹھی ہوا کرتی تھی۔ کوٹھی سے دور ہی اس نے سڑک کے کنارے گاڑی کھڑی کر دی اور خود قدم قدم چلتا کوٹھی کے سامنے درختوں میں آ کر چپ چاپ کھڑا ہو گیا۔ کوٹھی کے کمروں میں روشنی ہو رہی تھی۔ اس کمرے میں بھی بتی جل رہی تھی۔ جہاں کبھی اسکی پیاری ماں سویا کرتی تھی اور اس کمرے کے روشن دان بھی جگمگا رہے تھے جہاں سلمہ راتوں کو بیٹھ کر اس کے کام کیا کرتی تھی۔ اسلم درخت کے ساتھ لگ کر کھڑا تھا۔ اس کی پلکوں پر آنسو اپنے آپ آ گئے اور اس کے بھنچے ہوئے ہونٹ کپکپانے لگے۔ اس نے دیکھا جیسے اس کی ماں کی روح کوٹھی کے ویران باغ میں سے چل کر اس کے پاس آئی ہے اور ذرا فاصلے پر درختوں میں کھڑی ہو کر سرگوشیوں میں اس سے کہہ رہی ہے۔

"شادی مبارک ہو میرے بیٹے! خدا تم دونوں کو خوش رکھے۔ کیا ہوا اگر میں تمہاری بیوی کو اپنے گھر بیاہ کر نہیں لا سکی۔ میں تم دونوں کی خوشیوں میں شریک ہوں۔ لیکن تیرے بدنصیب باپ کا کوئی پتہ نہیں کہ وہ کہاں ہیں؟ کس حال میں ہیں؟ کوئی انہیں کھانا بھی کھلاتا ہے یا نہیں؟ وہ ضرور زندہ ہیں۔ اگر مر گئے ہوتے تو مجھ سے ضرور آن ملتے۔ میں ان کے لئے آسمانوں پر بھی پریشان رہتی ہوں۔ بیٹا! تجھے سہرا مبارک ہو! میری طرف سے بہو کے سر پر پیار کرنا۔ خدا حافظ میرے بچے! .... خدا حافظ .... خدا حافظ ...."

اس سے پہلے کے اسلم اپنا ماں سے کوئی بات کر سکے اسے یوں لگا جیسے اس کی روح آہستہ آہستہ درختوں کے درمیان رات کے اندھیرے میں گم ہو گئی۔ اس کے منہ سے بے اختیار "ماں جی" نکل گیا اور پھر درخت کے ساتھ گال لگا کر بچوں کی طرح روتا رہا۔ روتے روتے جب اس کے جی کا غبار کچھ ہلکا ہو گیا تو وہ تیزی سے وہاں سے نکل کر سڑک پر آ گیا۔ گاڑی میں سوار ہو کر گاڑی چلائی اور یونہی بے مقصد شہر کی ویران سڑکوں پر نصف شب کے بعد تک گھومتا رہا۔ پھر وہ شہر کے قبرستان میں آ گیا۔ قبرستان کے باہر کھڑے ہو کر اس نے فاتحہ کے لئے ہاتھ اٹھائے۔ وہ اپنی ماں کی قبر سے واقف نہیں تھا۔ لیکن اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے اس کی ماں قبرستان میں کسی جگہ دفن ہے۔ فاتحہ پڑھتے پڑھتے اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی ندیاں رواں ہو گئیں۔

اگلے روز جیلر صاحب کی کوٹھی میں ان کی پیاری بیٹی یاسمین کی شادی کا ہنگامہ مسرت برپا تھا۔ کوٹھی کو رنگ برنگی جھنڈیوں، پھولوں اور پتوں سے سجا دیا گیا تھا۔ شام سے پہلے ہی مہمانوں کی آمد شروع ہو گئی تھی۔ لان میں شامیانے لگا دیئے گئے تھے۔ کاروں کی قطاریں کھڑی تھیں۔ ہر طرف خوشیوں کے قہقہے بلند ہو رہے تھے۔ اسلم بہترین لباس پہنے دوستوں میں بیٹھا تھا۔ اور اندر یاسمین دلہن بنی سہیلیوں میں بیٹھی تھی۔ کوٹھی کے عقب میں پلاؤ اور زردے کی دیگیں دم کی جا رہی تھیں۔ چونکہ دلہا کا گھر بھی وہی تھا۔ اسلئے برات کے آنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ طے یہ پایا تھا کہ نکاح کے بعد دلہا دلہن کو شہر کے سب سے بڑے ہوٹل میں کافی کی دعوت دی جائے اور پھر دونوں واپس گھر آ جائیں۔ شام کے وقت نکاح پڑھا دیا گیا۔ یاسمین اسلم کی منکوحہ بن گئی۔ اب مہمانوں میں کھانا تقسیم کیا جانے لگا۔ لوگوں نے پتلونوں کی پیٹیاں کھول دیں اور خوب چبا چبا کر منہ بنا بنا کر وحشیوں کی طرح پلاؤ پر ہاتھ صاف کرنے شروع کر دیئے۔ ایک خاص کمرے میں اسلم کے خاص دوست بیٹھے تھے۔ ان کے سامنے سکاچ وسکی کی بوتلیں کھول دی گئی تھیں اور وہ اسلم کے ساتھ مل کر شراب پی رہے تھے اور اسلم کو مذاق بھی کرتے جا رہے تھے۔
ٹھیک اس وقت ایک مخبوط الحواس دیوانہ بوڑھا جس کے بدن پر چیتھڑے لٹک رہے تھے

اور وحشیوں کی طرح بڑھے ہوئے سفید بال میل میں اٹے ہوئے تھے۔ ہونٹوں سے رال بہہ رہی تھی۔ آنکھوں سے وحشت برس رہی تھی اور پاؤں میں پھٹے ہوئے جوتے رسیوں کے ساتھ بندھے ہوئے تھے۔ کوٹھی کے صدر دروازے پر نمودار ہوا اور پیٹ پر ہاتھ مار مار کر چوکیدار کو اپنی طرف متوجہ کرنے لگا۔ چوکیدار نے دو ایک بار جھڑک دیا اور وہاں سے بھاگ جانے کو کہا۔ پاگل آدمی بدستور پیٹ پر ہاتھ مارتا رہا اور اس کے بعد کتے کی طرح بھوں بھوں کرنے لگا۔ چوکیدار نے اسے چھڑی دکھلا کر دھتکارا۔

"بھاگ جاؤ۔ بھاگ جاؤ یہاں سے۔" پاگل بوڑھا غرایا۔

"بھوں بھوں۔" اور پھر اپنے پیٹ پر زور زور سے ہاتھ مارنے لگا۔ چوکیدار کے پاس ایک ٹیکسی ڈرائیور کھڑا تھا۔ اسے بوڑھے دیوانے پر ترس آگیا۔ اس نے چوکیدار سے کہا۔

"یار وہ تو بھوکا ہے۔ اسے دھتکار رہے ہو اور پھر پاگل بھی ہے۔ اتنی بڑی دعوت میں اگر یہ بھی دو نوالے کھالے گا تو کسی کا کیا بگڑ جائے گا۔"

چوکیدار کو بھی اس پاگل بوڑھے پر ترس آگیا۔ اس نے پاگل سے دیوار کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "بیٹھ جاؤ۔ میں کھانا لاتا ہوں۔"

اس کے بعد وہ شامیانے کے نیچے گیا۔ لوگوں کے بچے ہوئے جھوٹے چاولوں کی ایک تھالی اٹھائی اور پاگل کے پاس آگیا۔ پاگل آدمی نے اپنی میلی کچیلی جھولی پھیلا دی۔ چوکیدار نے جھوٹے چاولوں کی تھالی دیوانے کی جھولی میں الٹ دی۔ دولہا کے کمرے میں خوب دھماکہ چوکڑی مچی تھی۔ شاندار کیف آور اور سکاچ وسکی پینے کے بعد دولہا اپنے بہترین دوستوں کے ساتھ بیٹھا میز پر لگی ہوئی چمکیلی طشتریوں میں نہایت نفیس تازہ خوشبودار پلاؤ میں شوربا اور دہی ڈال کر بڑی نفاست کے ساتھ کھا رہا تھا اور اسی کوٹھڑی کے باہر دروازے کے ساتھ دیوار سے لگا دولہا کا وحشت زدہ آنکھوں والا خستہ حال پاگل باپ میلی کچیلی جھولی میں براتیوں کے منہ سے گرے ہوئے جھوٹے چاول کے نوالے گندی انگلیوں میں لپیٹ لپیٹ کر منہ میں ڈال رہا تھا۔ ٹھنڈے شوربے میں لتھڑے ہوئے چاول اس کے منہ سے گر کر ڈاڑھی کے بے ربط بالوں میں الجھ رہے تھے اور اس کا منہ خچر کی طرح چل رہا تھا۔ آنکھیں اپنے حلقوں میں وحشی جانور کی طرح ادھر ادھر گھوم رہی تھیں۔ بیٹے کو کوئی خبر نہ تھی کہ اس کا بدنصیب باپ باہر فٹ پاتھ پر فقیروں سے بھی بدتر حالت میں بیٹھا بھیک میں لئے ہوئے چاول کھا رہا ہے۔ باپ کو کوئی خبر نہ تھی کہ اندر اس کے بیٹے کی برات بیٹھی ہوئی ہے اور اس کی بہو دلہن بنی بیٹھی ہے۔ اگر وہ صحیح حالت میں ہوتے تو انہیں اس کوٹھی میں سب سے اونچی جگہ ملتی لیکن وہ خوشیوں، غموں، اونچ نیچ اور عزت و وزارت کی سرحدوں سے بہت دور نکل چکے تھے۔۔۔۔ برات کے رخصت ہونے کا وقت آگیا

۔ ایک ہاروں سے لدی ہوئی خوبصورت کار کوٹھی کے گیٹ کے پاس آکر کھڑی ہو گئی۔ دولہا اور دلہن اپنے دوستوں اور عزیزوں کی سنگت میں بن سنور کر چمکیلے اور شگفتہ چہرے لئے کوٹھی کے گیٹ کی طرف بڑھنے لگے۔ یہ جلوس سجی سجائی کار کے پاس آکر رک گیا۔ یاسمین کے باپ نے پہلے دولہا کو سینے سے لگا کر پیار کیا۔ پھر اپنی بیٹی یعنی دلہن کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ ایک عورت نے دولہا دلہن سے سر پر کبوتروں کا جوڑا وار کر فضا میں چھوڑ دیا۔ دوسری عورت نے ان کے قدموں میں کڑوے تیل کی ایک لکیر ڈال دی۔ کار کے پاس ہی فٹ پاتھ پر کوٹھی کی دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھے ہوئے خستہ حال پاگل میر صاحب سفید سفید دیدے گھماتے یہ سب کچھ دیکھ رہے تھے اور ان کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے۔ وہ جبڑے ہلا ہلا کر جھولی میں سے جھوٹے چاول نکال نکال کر بدستور کھائے جا رہے تھے۔ دولہا دلہن کار میں سوار ہو گئے۔ دوستوں نے ان پر پھول برسائے۔ عورتوں نے ان پر پیسے پھینکے۔ ایک پیسہ میر صاحب کے پاس آن گرا۔ انہوں نے لپک کر اسے اٹھا لیا اور جبڑے ہلاتے ہوئے دیر تک اسے دیکھتے رہے اور پھر اپنی جھولی میں ڈال لیا۔ کار سٹارٹ ہو گئی۔ لوگ ہاتھ ہلا ہلا کر دولہا دلہن کو رخصت کرنے لگے۔ اسلم اور یاسمین نے بھی ہاتھ کار کی کھڑکی سے باہر نکال لئے۔ پاگل میر صاحب اٹھ کر کھڑے ہوئے اور حیرانی کے عالم میں یہ سب تماشا دیکھنے لگے۔ کار گزر گئی۔ لوگ باتیں کرتے اپنی اپنی گاڑیوں میں سوار ہونے لگے۔ دیوانے میر صاحب نے دو تین بار فضا میں مٹھیاں ہلا ہلا کر منہ سے بھوں بھوں کر کے کتے کی طرح بھونکا اور پھر ایک ہاتھ سے جھوٹے پلاؤ والی جھولی تھامے' دوسرے ہاتھ سے ہوا میں خیالی کتوں کو پتھر مارتے' چیتھڑے لٹکائے گھسیٹ گھسیٹ کر اس طرف کو چل دیئے جس طرف کو ابھی ابھی ان کے بیٹے کی برات گئی تھی۔

اے حمید

جولائی ۷۱ء

فلیمنگ روڈ۔ لاہور